اندوختہ

اکرام باگ

گوپی چند نارنگ

اکرام باگ اردو افسانے کے ایک تاریخی موڑ کی یاد دلاتے ہیں وہ ایک کاروان کے ساتھ بھی تھے اور نہیں بھی تھے ان کی فن کاری ان کی اپنی فن کاری ہے۔ بیانیہ کی بناوٹ کرداروں کے اندرون میں جھانکنا اور نفسیاتی گرہوں کی ہلکی گہری اشاریت ان کی خاص ذہنی نہج بن گئی ۔ ادبی مراکز سے دوری اور بھیڑ سے الگ ہونے کی خواہش اور اختصار پسندی ان کی تحریروں میں طرح طرح سے ظاہر ہوتی رہی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو اپنے کرداروں کی ساخت، قصباتی جزئیات اور دھندلی دھندلی معاشرتی فضا سے جو نقش ابھرتا ہے اردو افسانے میں وہی ان کا دستخط بن جاتا ہے جس سے وہ الگ پہچانے جاسکتے ہیں۔

دسمبر ۲۰۱۳

اکرام باگ

اندوختہ

(افسانے)

افلاک پبلی کیشنز گلبرگہ

ANDOKHTA

COLLECTION OF SHORT STORIES

IKRAM BAAG

PP.: 224, Year of Publication : 2014, Price : Rs. 300/-

***Publisher:* AFLAAK PUBLICATIONS**

White House, New Bank Colony, Bilalabad, Gulbarga-585104. Karnataka

کتاب : اندوختہ (افسانے)

مصنف : اکرام باگ

اشاعت : 2014ء

سرورق : اعجاز مصور/ سید مشتاق فاروق

کمپوزنگ : حسن محمود

طباعت : اورین پرنٹرس حیدرآباد

باراول : پانچ سو

قیمت : تین سو روپے

اہتمام : اکرم نقاش

ملنے کے پتے :

مصنف : ڈاکٹر اکرام باگ، چیرمین، شا ایجوکیشنل اینڈ کلچرل ٹرسٹ،
بسواکلیان، ڈسٹرکٹ بیدر (کرناٹک)

Mob.: 09945969995 - 07204176727

ناشر : افلاک پبلی کیشنز وہائٹ ہاؤز نیو بینک کالونی بلال آباد گلبرگہ (کرناٹک)

E-mail: akramnaqqash61@yahoo.com

Cell: 09845390893

شہباز

شہیر

ساحل

کے لیے

فہرست

حرفِ چند (اقتباسات)

افسانے

حرفے چند

(اقتباسات)

شمس الرحمٰن فاروقی

اکرام باگ کے افسانوں کی سب سے نمایاں خصوصیت اُن کی کچھ پراسرار، کچھ خوف آگیں فضا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا ہماری دنیا میں موجود ہوتے ہوئے بھی کسی ایسی جہت میں گامزن ہے جو اُسے روزمرہ کی دنیا سے الگ لے جانے کے لیے کوشاں ہے۔ عام دنیا کی اشیا اور مقامات اور کوائف بھی ان افسانوں میں کچھ سرمئی، تاریک، گرد آلود رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔

اکرام باگ کی نثر اپنے قاری کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت نہیں کرتی۔ وہ بظاہر سادہ لیکن بہ باطن پیچیدہ نثر لکھتے ہیں۔ پڑھنے والا اگر متوجہ نہ ہو تو اس نثر کی خوبیاں اُس کی نگاہوں سے اوجھل رہ جاتی ہیں۔ اُن کی نثر بے حد گھٹی ہوئی اور ان کا ایک ایک لفظ دیوار میں چنی ہوئی اینٹ کا حکم رکھتا ہے کہ اگر ایک اینٹ بھی نکال دی جائے تو دیوار کی کلیت مجروح ہو جائے۔ چھوٹے، گھٹے ہوئے جملے، اثر آفرینی کی واضح اور کھلی ہوئی کوشش سے بالکل مبرا۔ جملوں میں سحر کی سی قوت ہے جو آہستہ آہستہ قاری پر مستولی ہو جاتی ہے۔

اکرام باگ کے افسانوں میں اشیا کے، احساسات کے، زندگی کے رایئگاں جانے کا تصور حاوی ہے اور اُس کے ساتھ ان چیزوں کے ہوجانے کی تمنا، جو ہو نہیں سکتی۔ پھر ان چیزوں کی جگہ نقلی چیزیں رکھ کر حقیقت کو بہلانے کی کوشش نظر آتی ہے۔(''اندوختہ'' کے متکلم وحید نے اپنی لڑکی کا نام اُس لڑکی کے نام پر رکھا ہے جو اس کی معشوقہ نہ بن سکی اور خود اُس لڑکی نے اپنے بچے کا نام افسانے کے متکلم کے نام پر رکھا ہے)لیکن یہ سب زیاں کیوں ہے۔ چاہی ہوئی چیزیں کیوں قوت سے فعل میں نہیں آتیں؟ ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کے لیے اکرام باگ قاری کو تنہا چھوڑ دیتے ہیں ۔وہ جھوٹے حل پیش کر کے قاری کو دھوکہ نہیں دینا چاہتے۔ ''حیات'' نامی افسانے میں ''حیات'' بہ معنی زندگی بھی ہے اور افسانہ نگار کے اس کردار کے بھی معنی میں ہے جو افسانہ نگار سے کھو گیا ہے، یا جدا ہو گیا ہے۔ دونوں صورتوں میں ''حیات'' کے معنی تو معلوم ہو سکتے ہیں لیکن کیفیت نامعلوم رہتی ہے۔

اکرام باگ کے افسانے بنیادی طور پر ذاتی المیے کی داستانیں ہیں۔ انھوں نے تجرید اور شدتِ تاثر سے بھرے ہوئے افسانے لکھے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں علامت کے پردے میں تمام تر رعنائی اور رنگینی کے ساتھ باہر کی روشنی اور اندر کی روشنی کو یک جا چھان کر نئے رنگوں میں پیش کرتے ہیں۔

اکرام باگ کے افسانوں کا مجموعی تاثر زیاں اور گزران کے ماتم کا ہے۔ دنیا کارگاہِ عمل تو ہے لیکن اس کے عمل زیادہ تر زیاں، گم شدگی کی طرف لے جاتے ہیں۔ انسان اپنی تمام ذہنی اور علمی قوتوں کے باوجود دنیا میں پوری طرح قائم نہیں ہوتا۔ اس کے دوست اور چاہنے والے ہی اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

اُن کی تحریروں نے جدیدیت اور ''شب خون'' کو اعتبار بخشا۔ اگر چہ میں ان کے بارے میں کبھی کچھ لکھ نہ سکا لیکن جدید ادب کی جدوجہد اُن کے بغیر کامیاب نہ ہوتی۔ ●●

سید مجیب الرحمٰن

اکرام باگ کلاسیکی لکھنے والوں سے مختلف سمت میں جاتے ہیں۔کلاسیکی لوگ کرداروں کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔کہ جیسے وہ آخری حقیقت ہوں۔مگر اکرام باگ ان کے نام تک نہیں رکھتے۔میں ایک، میں دو، وہ ایک اور وہ دو یا ہندسوں سے زیادہ نام نہیں دیتے۔گویا یہ سب نشور ہیں۔فانی ہیں۔انکی ہستی تب ہی سچی ہوگی جب وہ ان کریہہ نیتوں اور کریہہ اعمال سے نجات پاکر مکمل اکائی بن جائیں۔کردار کی عکاسی پردہ الفاظ کے اصراف کے خلاف ہیں۔مگر وہ اتنی چابک دستی سے استعاروں سے کام لیتے ہیں کہ اس سے کردار کی ساری کیفیت سما جاتی ہے۔مثلاً چمگادڑ شاہزادی، شاہزادہ، پرچھائیں، سائرن، سیٹی، کلوروفل زدہ جھاڑ، 45 درجہ کا زاویہ (محبت کرنے والا) سور، زنگ آلود ہتھیار، بیساکھی، ریگ زار، بوڑھا بندر، دیمک، دھواں، شیر، بلی، ریگستان، کالا سانپ، گرگٹ، سیاہ عمامے، گوریلا، دستخط (بے اصولے شادی کے گواہ) مرغیاں وغیرہ۔

اکرام باگ کے سارے افسانوں کا نچوڑ یا تو فکری نتائج ہیں یا فلسفیانہ تجرید ،اچھے فن پارہ میں یہ تصویر ملتی ہے کہ جذبوں سے کردار بنتے ہیں اور کرداروں کے عمل سے

مواخذہ۔ اکرام باگ اس پورے عمل کو مواخذہ یا مکافاتِ عمل NEMESIS کو ظاہر کرنے والے استعاروں سے ماورا کر لیتے ہیں اور نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جب تک آدمی اکائی نہیں بن جاتا ہے اسے مکافات سے نجات نہیں۔ اکائی بننے کا طریقہ کار کیا ہوگا۔ وہ تفصیل سے نہیں بتاتے ہیں مگر کسی کردار کے ذریعہ وہ اشارہ کرتے ہیں:

''میں اچھی غذا ہی نہیں بلکہ اس کی لذت کو بھی محسوس کرنا چاہتا ہوں''

ان کا یہ جملہ بہت فلسفیانہ اور پُر مغز ہے کہ انسانی ذہن کی تہذیب اسی طرح کی جاسکتی ہے کہ وہ مشاہدہ کے ہم رکاب رہے پراگندہ نہ رہے۔

بودلیر نے فکری نعرہ لگایا تھا کہ فطرت کراہتوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور فن کار کا کام ہے کہ فن کے ذریعہ فطرت کی کمیوں کو دور کرے۔ اکرام باگ کے یہاں فطرت میں اذیت پسندی کے عنصر کی عکاسی بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ کبھی اذیت سادیت SADISM یعنی ایذا رسانی کی شکل میں ہے تو کبھی اذیت کے روپ میں MASOCHISM اکرام باگ کہتے ہیں۔

''انسان بھی کتنا ستم ظریف ہے کہ الزام رکھنے کی عادت کا خواہ وہ اپنی ہی ذات پر کیوں نہ ہو کس بُری طرح شکار ہے۔ اسے ایک پل چین نہیں رہتا۔ کسی نہ کسی کو مجرم ٹھہرا کر وہ اپنے اندر طمانیت اور سکون چند لمحوں کے لیے سہی پیدا کر لیتا ہے۔''

ایک دوسری جگہ وہ کہتے ہیں:

''زندہ فن کی تخلیق کے لیے کسی پریرنا کا ہونا ضروری ہے، یہ پریرنا کا غم ہونا یعنی کسی محبوب شئے کو نہ پاسکنے کا غم۔''

گویا ان کو قدرت کا یہ قانون پسند نہیں ہے کہ فطرت کی زحمت ہی سرچشمۂ فیضان بنے۔ خود رحمت فیضان کیوں نہ دے۔ یہی ان کا بنیادی سوال ہے۔

وہ روح کے بارے میں بدّھ کے انداز میں سوال کرتے ہیں کہ

''انسان میں جینے کی تمنا کتنی فربہ ہے۔ زندگی خواہ گھسیٹ
گھسیٹ کر ہی گزرے مگر وہ موت کے آرام دہ بستر پر سونا
نہیں چاہتا۔ جینے کی ہوس نے ہی شاید روح کی عظمت کا
فلسفہ ایجاد کیا ہوگا۔ وہ موت کے وقت بھی یہ یقین کر کے خوش
رہتا ہے کہ کم از کم اس کی روح تو ہمیشہ کے لیے زندہ رہے
گی۔''

سائنسی اذیت کو وہ ایک کردار کی شکل دے کر کہتے ہیں۔

''سائنس داں قتل کے پاس پہنچ کر کہتا ہے ہماری مسکراہٹ
میں ہیروشما کا سارا درد مسکرا رہا ہے۔''

ذہن کی عدم تمکینی IN-STABILITY کے بارے میں وہ کہتے ہیں

''کھانا کھاتے ہوئے میں صرف اس کی لذت سے لطف
اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ انسان کا شعور لاشعور ایک ہو جائے
یہی میری آرزو ہے۔ آخر میں مکمل اکائی کیوں نہیں
ہوں۔ جس دن آدمی مکمل اکائی بن جائے گا شاید اسے اپنے
فنا ہونے کی کسک نہ ستائے۔''

گویا اس پیراگراف میں ذہن کی تہذیب کے طریق کار کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ ہم مکمل اس لیے نہیں بنتے کیوں کہ ہم حقیقت کے ساتھ ساتھ باشعور نہیں ہیں۔ مشاہدہ کا باقاعدہ شعور ہمیں لاشعور کا مالک بھی بنا دے گا۔ تب قطرہ سمندر بن جاتا ہے۔

اروٹک آرٹ میں عشق اور فلسفہ کی مثالیں بے انتہا ہیں۔ بھگتی تحریک اور صوفی شعرا کا سارا کلام اسی کے زیر اثر میرا بائی، کبیر، نانک، اکا مہادیوی تو خدا کو اپنے محبوب کی طرح مخاطب کرتے تھے۔

اکرام باگ کے آرٹ کو بھی ہم عشق اور فلسفہ کے خانے میں ڈال سکتے ہیں۔ عشق کی جب شروعات ہوتی ہے تو وہاں ساری کائنات میں صرف دو ہی ہستیاں رہتی ہیں۔ ایک موضوع SUBJECT اور دوسرا معروض OBJECT اور جب

عشق اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو نہ ہی وہاں موضوع ہوتا ہے اور نہ معروض۔ایک شونیہ کی حالت ہوتی ہے۔اکرام باگ دوصوفیوں کی بحث کواپنے افسانے میں جگہ دیتے ہیں۔اور خود بھی اس سے مستفید ہونے کا انداز ظاہر کرتے ہیں۔ایک نقطہ نظر کا صوفی کہتا ہے کہ وجود کے ہر مظہر میں خدا کا ہی وجود ہے۔(وحدت الوجود)اور دوسرا کہتا ہے کہ خدا کا وجود الگ قسم کا ہے،اور اس کی تخلیق کا الگ (وحدت الشہود)اس بحث سے اکتا کر وہ اس تجریدی نقطہ پر پہنچتے ہیں کہ ہمیں مکمل اکائی بن جانا چاہئے۔یہاں بھی ہم اکرام باگ کو بدھ کے تصور سے مماثلت رکھنے والا پاتے ہیں۔غالباً انھیں وجود کی بحث رٹی رٹائی اصطلاحیں لگتی ہیں۔گوتم بدھ نے کہا تھا کہ ہم حواس سے واقف ہیں اور اشیاء کو بھی دیکھتے ہیں۔ان دونوں کے ملن سے ایک جوش پیدا ہوتا ہے۔جو یادوں کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہی یادیں آرزو کی شکل میں مماثل حالات میں بار بار جگہ جگہ جنم لیتی ہیں۔گویا یہ سب دل کو گرفت میں لینے والی یادیں سنسکار میں ہمارے سامنے آتی ہیں کہ ہمیں پورا کرو۔اور وہ سدا خوش کامی سے محروم ہوتی ہیں۔آدمی کی خوش کامی تو اس میں ہے کہ وہ خود کو غیر محدود بنانے میں لگ جائے۔بس یہی ایک آرزو ہے جو سچی ہے۔اس غیر محدود پن کا کوئی نام نہیں ہے۔حسن نہیں۔اور نہ کوئی فارم۔ ●●

افتخار امام صدیقی

اکرام باگ کی پہلی کہانی 'دم' 'افعی' اور اس کے بعد تازہ ترین دست یاب کہانی ''توفیق'' تک ان کے افسانوں کی پوری طرح افہام وتفہیم نہیں ہوسکی۔ جدید تر کہانی کے اس اہم نام کو محض تجریدی وعلامتی کہانی یا تجربوں کی کہانی کی ایک مختصر تاریخ کے باب میں جگہ مل گئی لیکن شاید کہانیاں اپنے باطن میں تخلیقی آگ چھپائے ہوئے ہیں، ان پر مکالمہ نہیں ہوسکا۔ اس کی کئی ایک وجوہ ہیں۔ مگر ان وجوہ سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف کہانیوں کے باطن اور اکرام باگ کے تخلیقی جوہر سے بھی گفتگو کی جاسکتی ہے۔ کیوں کہ اکرام باگ کی کہانیاں اپنے تمام تر الجھاوؤں کے باوجود نظرانداز نہیں کی جاسکتیں، انھیں محض اس لیے رد نہیں کیا جاسکتا کہ یہ افسانے کے رواں منظر میں نہیں سماتیں یا انھیں افسانے کی کلاسیکی روایت میں بھی نہیں رکھا جاسکتا۔ یہ کہ سرے سے یہ افسانے ہی نہیں، اگر یہ افسانے نہیں تو پھر یہ کس نوعیت کی تحریریں ہیں؟

ایسا تو نہیں کہ افسانے محض خواب سراب ہوں، جو فقروں، جملوں میں بغیر کسی ترتیب کے اتر آئے ہوں۔ اپنی تخلیقی ترتیب میں ماجرہ، ان کہانیوں سے باہر کوئی بھی گفتگو، کوئی بحث، کوئی مکالمہ، اکرام باگ کو سمجھنے میں زیادہ معاون نہیں

ہوگا۔تصوف، مذہب، علم نجوم، جمالیات، کے ساتھ تخلیق کیے گئے یہ افسانے اب بھی انتظار کررہے ہیں اپنے قاری کا۔ سچے اور باشعور نقادکا اور خاص طور پر جدیدیت کے ان مبلغین کا جو اس نوع کی کہانیوں ہی کے خواہش مند تھے۔



مہدی جعفر

اکرام باگ کے افسانے تجریدی اظہار پر محمول ہوتے ہوئے اینٹی اسٹوری کی جانب قدم بڑھاتے ہیں۔ان کے افسانے بالکل ہی منفرد انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ عام طور سے افسانہ نگار حضرات اپنے منفرد رویے اور رجحان کی خالصیت کو نمایاں کرنے سے شعوری یا غیر شعوری گریز کرتے ہیں ۔ یہ ایک طرح کی بے اعتمادی ہے جو دراصل اپنی انفرادی پہچان اور اپنے خالص رویے کی اچھی طرح دریافت نہ کر پانے کے باعث ہوتی ہے جس میں دوسرے افسانہ نگاروں اور قاری سے ربط کا تیقن اور آہنگ رکھنے کی کوشش شامل ہوتی ہے۔نتیجہ کے طور پر تخلیق خارج کے اثرات سے نسبتاً زیادہ متعلق ہو جاتی ہے اور داخل کے عوامل اور طریق کار سے کم۔ کُلی انفرادیت کا بے پایاں اظہار جو موضوع سے انحراف پر اکساتا ہے اسے دبا جانے اور پس پردہ رکھنے کے طریقہ سے افسانہ نگار اپنے وجود اور نام کی پہچان برقرار رکھنے میں کوئی خوف محسوس نہیں کرتا۔ جب کہ مکمل انحراف میں افسانہ نگار اس بات سے ڈرتا ہے کہ کہیں وہ اپنی عام آواز گم نہ کر دے اور ہم عصر رجحانات اس کے افسانوں کو کاغذ کے انبار میں دفن نہ کر دیں۔اس لحاظ سے اکرام باگ کے یہاں ایک جرأت ملتی ہے اور ان کے افسانے موضوعی محور کے گرد گھومتے نہیں

بلکہ ان کے یہاں موضوع کی روایتی بنت سے انحراف ملتا ہے۔دوسری چیز جو افسانوں کو اینٹی اسٹوری سے قریب کر دیتی ہے وہ وقت کا ٹھہراؤ ہے۔وقت تقریباً ایک ہی نقطہ پر رُک کر افسانے کی تخلیق کرتا ہے یا نہایت سُست روی سے آگے بڑھ کر ایک دائرے کی شکل میں اپنے پہلے سرے سے جڑ جاتا ہے۔مثال کے طور پر''اقلیما سے پرے ہو'' کے ابتدائیہ حصے میں انفرادیت کے داخلی عوامل ٹکراؤ پیش کرتے ہیں۔ابتدائے آفرینش سے آج تک فرد پر جو کچھ گزری ہے اس کا احتساب اور آج کی سطح پر اس کا ردِ عمل شعور کی رَو جیسی کیفیت سے اُجاگر ہوا ہے۔روایتوں کے گذشتہ اثرات عصرِ حاضر کے عوامل کے سامنے اپنے بے دست و پا ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔یہ سب کا سب ایک ہی لمحہ ہے۔وقت کی ایک ہی سطح ہے۔اس لیے کہ یہ مرکزی کردار کی زندگی کے بہت محدود حصہ پر مرکوز اور محیط ہے جس کا ثبوت افسانہ کے شروع کا ایک پارہ ہے اور وہ پارہ جو اختتامیہ ہے:

> ''شام تھی۔میں ویسٹ انڈیز اور انڈیا کی کرکٹ کمنٹری سے فارغ ہو کر صحن میں پہنچا تو شہتوت کے درخت کے قریب وہ آنکھیں یک ٹک مجھے گھور رہی تھیں۔تنفس سے نکلا۔اقلیما۔اور میں شفق آسا وادی میں ڈوب گیا۔وہیں بیت الخلا سے متصل دیوار کے قریب ہم نے بدنام لفظ کی دیوار کو آخری اینٹ دے دی''.........
>
> ''میں رفع حاجت کے لیے اُٹھتا ہوں مگر صحن میں کھڑا نیم کا درخت میرے قدم روکتا ہے۔ تنے سے سر ٹکائے، آنکھیں میچے ،ہدایت کردہ سمت میں منہ اُٹھائے، دہراتا ہوں، جب آنکھوں سے روشنی اُچک لی جائے گی اور.....''
>
> (اقلیما سے پرے ہو)

'رخشِ پا' انفرادی حیثیت سے اہم ہے۔شاید یہ ان کی پہلی کہانی ہے جہاں سے وہ انفرادیت کی ایک نئی سطح کی نمائندگی کرتے ہیں اور شاید یہیں سے وہ روایت سے

مکمل انحراف کرتے ہیں۔اس کہانی میں 'میں' ایک عجیب وغریب میڈیم میں سانس لیتا ہے۔ یہ میڈیم لاشعوری حیثیت رکھتا ہے۔اس میں شخصیت کا تو تاؤ،شعور کی رو،'میں' کی داخلی حیثیت اور وسعت،'میں' کی اجتماعیت اور سماجی ربط،جبلت اور وجدان کے عناصر،داخلی اور حسیاتی سطح پر ہوتے ہوئے بھی منطقی نتائج سامنے لاتے ہیں۔نتائج حاصل کرنے کا طریق کار ریاضی اور بالخصوص اشکال ریاضی کی بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ تجریدی طور پر فلسفۂ کیمیا اور حیاتیات بھی فن کے ساتھ آمیزش رکھتے ہیں۔ دوسرے افسانے جن میں یہ منفرد سطح کارفرما نظر آتی ہے۔'ہندسۂ عبث'،'عکس فنا'،'اسیر ہندسہ'،اور'ہر طرف فاصلے' ہیں۔ان سبھی افسانوں میں انفرادیت کی ریاضیاتی سطح خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقلیدس کا یہ کہنا کہ سارا عالم سوائے جیومیٹری کے اور کچھ نہیں ،شاید انفرادیت کے انھیں فعال ذہنی عوامل کا بروئے کار لانا تھا جنھیں اکرام باگ نے اپنے افسانوں کی نہج پر استوار کیا ہے،اور برٹرینڈ رسل نے اپنے فلسفہ کی سطح پر جگایا ہے۔کچھ بھی ہو مگر یہ بات ضروری ہے کہ اکرام باگ کی تخلیقی رو اقلیدسی ہے اس لیے کہ ہر افسانے میں ریاضیاتی،منطقی یا سائنسی طریق کار ملتا ہے۔جدید افسانے میں اس طریق کار کا امتزاج بنیادی فنی عوامل کے ساتھ،جن کا علاقہ منطق سے پرے ہوتا ہے،ایک انوکھی اور اہم خصوصیت ہے۔اکرام باگ باریک سے باریک نقطوں پر دیر تک ٹھہر کر قاری کو اس کی معنویت اور مفہوم اپنے اظہار کے توسط سے سمجھاتے ہیں۔البتہ اس طرح ان کے کچھ افسانے اپنی وضاحت اور ایک سطحی داخلیت کی وجہ سے افسانہ کم اور مضمون زیادہ معلوم ہوتے ہیں اور ایک وقیع پس منظر کی عدم موجودگی کی وجہ سے قاری کی دلچسپی کے قائم رہنے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔افسانوں میں Persona یا 'میں' کی انفرادیت اپنی داخلی بنت رکھتی ہے اور خارج سے اس کا علاقہ کم ہوتا ہے۔خارج کو اہمیت کم دینے کی وجہ سے افسانوں میں وہ تانے بانے بڑی مشکل سے ملتے ہیں جن کے ذریعے افسانوں کا بنیادی ڈھانچہ آسانی سے گرفت میں آسکے۔یہ بہرحال افسانوں میں دنیا،مذہب اور انسانی وجود کی سہ جہتی آسانی سے پہچانی جاسکتی ہے جو آپس میں عمل اور رد عمل کے ذریعے ذوجہتی ابھرتی رہتی ہے۔خارج کے توسط سے قاری تک رسائی کی بات

اتنی ضروری نہیں کہ اس کوشش میں افسانہ نگار اپنی بنیادی انفرادیت سے دست بردار ہوجائے یعنی اپنی تخلیقی رو سے رشتہ توڑ لے۔لیکن اکرام باگ کے چند افسانے خارجیت کی طرف اس تیزی سے بڑھتے ہیں کہ وہ داخلیت کی پہچان کھودینے پر آمادہ نظر آتے ہیں اور اپنی اقلیدسی بنت کو تج دیتے ہیں۔ حالاں کہ وہ خارجی کیفیات اور مظاہر میں اس مخصوص جہت کی تصویر کشی کر سکتے تھے اور داخل اور خارج کے دائرے کو باہم ملا سکتے تھے۔'کابوس'،'ادھورا پہیہ'،'چیچی'،'تقلب'اور'تصحیح'وہ افسانے ہیں جن میں کوشش خارج کی طرف سے ہے۔مگر یہ افسانے غالباً اس لیے ناکام ہیں کہ یہ صرف تجربہ کی صورت میں تخلیق ہوئے اور ان میں سے کئی انور سجاد کے اسلوب اور تکنیک کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ان تجرباتی کوششوں اور غیر تکملیت کے احساس کو'ادھورا پہیہ'میں لاشعوری یا شعوری نہج پر دیکھا جاسکتا ہے۔

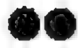
> ''جب یہ احساس اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو میں اپنی دیوانگی اور فن کاری اُس دیمک زدہ لکڑی پر صرف کرتا ہوں کہ کسی طرح پہیہ مکمل ہوجائے اور ہم اسے سہ رنگی سطح پر معلق کیے اپنی بازیافت اور تکمیل کو دیکھ سکیں۔مگر اندر کا چھوٹا دائرہ باہر کے وسیع دائرے سے دیمک کے باعث جڑ نہیں پاتا۔''
>
> (ادھورا پہیہ)

اکرام باگ کے افسانے تجریدی ہیئت اور رمز کے حامل ہوتے ہیں۔انھوں نے روایتی پلاٹ والی کہانیوں سے انحراف کیا۔'اقلیما سے پرے ہنوز'،'اسم اعظم'،'تقیہ بردار' رمزیہ صفت سے متصف ہیں۔اکرام باگ کا حالیہ افسانہ'توفیق'بھی اپنی رمزیہ شناخت پر مصر ہے۔

> ''سلسلہ اور کھیل دونوں ہی رمز ہیں۔مجھے آج بھی اس باب میں یقینی شک ہے کہ کون کس رمز سے کب وابستہ ہوا۔میں تم سے اس بات کی وضاحت ضرور کروں گا کہ اس سلسلے کا آخری سرا مرکزی اقامت گاہ نہیں ہے۔لیکن تم اگر اسے کھیل سمجھو تو

اس باب کا آخری سرامرکزی اقامت گاہ تھی۔اپنی اپنی
توفیق۔"

ان کے یہاں نامیاتی جسامت Organic Growth نہیں ملتی۔ان کی افسانوی ہیئت میں الفاظ کی اچھوتی اور نئی ترکیب ملتی ہے جو اپنے استعمال میں بڑی خوب صورت تاثیر پیدا کر دیتی ہے۔مثلاً 'باعث یاد' 'منقلب سوئی' 'کھلی ہوئی دوپہر' 'عدم پانی' 'مچھلیوں کے آئینے' وغیرہ۔زبان تھم تھم کر آگے بڑھتی ہے اور اپنا الگ آہنگ بناتی ہے۔داخلیت کے اظہار کے لیے اکرام باگ جو زبان استعمال کرتے ہیں وہ اس لحاظ سے توازن اور تناسب رکھتی ہے اور جس پر بہت کم افسانہ نگار دسترس رکھتے ہیں۔



اکرم نقاش

افسانے کی متداول شعریات سے انحراف اور افسانے کی نئی رسومیات کے اختراع کی سعی اکرام باگ کے افسانوں میں آسانی سے تلاش کی جاسکتی ہے۔اکرام باگ نے جس طرز کے افسانے لکھے،افسانوں میں جیومیٹری، ریاضیات اور طبعیات کی اشکال کوفنی اظہار کا ذریعہ بنایا اور جو ہیئتی تجربے کیے اس کی نشانیاں اُس دور سے پہلے ملنا محال تھیں ہی اس کے بعد بھی اس سطح کی تجربہ پسندی وتجریدیت کی مثال مشکل سے ملے گی۔اکرام باگ کا افسانوی کرافٹ محض Craftsmanship نہیں بلکہ ایک تخلیقی کرافٹ ہے۔اکرام باگ کہانی بیان کرنا نہیں،کہانی کو دبیز پردوں میں چھپانا چاہتے ہیں جس طرح سورج کی کرنیں مہین ملبوس میں پوشیدہ خدوخال کی ہلکی ہلکی جھلک دکھاتی ہیں اسی طرح اکرام باگ کہانی کے ان ہی پہلوؤں کو اُجاگر کرنا چاہتے ہیں جہاں سے تجسس جنم لینے لگتا ہے،اسرار پنپنے لگتا ہے، یہ عمل کہانی بیان کرنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ان کی کہانیاں قاری پر کھلتی نہیں ہیں،موضوع قاری کی گرفت سے دور ہوتا ہے لیکن ایک پر کیف اسرار وانبساط ایک نامانوس سرشاری ذہن پر دیر تک چھائی رہتی ہے۔

بیانیہ کی تکنیک بے حد مختلف ہونے کے باوجود اکرام باگ اور نیر مسعود ہمارے عہد کے ایسے افسانہ نگار ہیں جو اسرار و تجسس خلق کرنے، کہانی کے بیان سے گریزاں اور موضوع کو پردوں میں چھپانے کے فن میں مماثل نظر آتے ہیں۔

اپنے فن پر غیر معمولی اعتماد، صلے و ستائش کی تمنا سے بے نیازی اکرام باگ کے Genuine فن کار ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ پُر اسراریت ان کے فن ہی نہیں شخصیت کا بھی خاصہ ہے۔ ●●

افسانے

توفیق

''سلسلہ اور کھیل دونوں ہی رمز ہیں۔''

مجھے آج بھی اس باب میں یقینی شک ہے کہ کون کس رمز سے کب وابستہ ہوا میں تم سے اس بات کی وضاحت ضرور کروں گا کہ اس سلسلے کا آخری سرامرکزی اقامت گاہ نہیں ہے۔ لیکن تم اگر اسے کھیل سمجھو تو اس باب کا آخری سرامرکزی اقامت گاہ تھی۔ اپنی اپنی توفیق۔

میں متعین کردہ وقت پر بس اسٹینڈ پہنچا۔ مجھے یقین تھا اور میں نے دو ٹکٹ لے لیے تھے۔ سامنے پولیس اسٹیشن میں ہجوم کسی جانے پہچانے قیدی کو احاطے سے اچک اچک کر دیکھنے میں مشغول تھا۔ ایک ان جان سی تشویش مجھے بھی ہو رہی تھی۔ بار بار میری نظریں ہر گزرتے ہوئے رکشہ پر ٹک جاتیں۔ شام کے سائے پھیل گئے تھے۔ دور سورج درگاہ کے کلس

پر ہانپ رہا تھا۔رات کے اندھیرے میں میں نے تمھارا لرزتا ہاتھ پکڑا تو خود میرا جسم بھی ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔تم جانتی ہو کہ وقت سفر میں نے متعین نہیں کیا تھا۔اس وقت تمھاری عارضی اقامت گاہ تک پہنچنا تقریباً ناممکن تھا۔تارکول کی سرد سڑک سے پتلی گلی میں مڑتے ہوئے گرم مرکزی اقامت گاہ ہماری متوقع منزل تھی۔نیم اندھیرے کمرے میں سر کے مقابل بلجیمی آئینہ متحرک ہوا۔اب سامنے دیوار سے لگے ہک میں رسمی سبز لباس لہرانے لگا اور غیر رسمی دودھیا لباس زیب تن ہوا۔سفید پنڈلیوں پر مانوس بھوری روئیں کے لمس پر تنفس رک گیا۔پھر اچانک سفید و سیاہ لکیروں کے تحرک پر دودھیا مخصوص ہیئت میں نیم اندھیرا تلملانے لگا۔تمازت کے کبوتر سینے کے اندر پھڑ پھڑاتے رہے،چاروں طرف دلدل تھی۔زمین سے ابھرتی ہوئی دلدل جو فضاؤں میں پھیلتی جا رہی تھی۔اپنی پہچان کے سارے غوطے دلدلیسٹ ہو گئے۔حد یہ ہے کہ بلجیمی آئینے میں مجھے اپنی شکل نظر نہیں آئی۔صرف سیاہ اور سفید لکیروں کا مونتاژ۔ابھرتا اور پھیلتا جا رہا تھا۔

جب صبح کے بطن سے مڑی تڑی رات طلوع ہوئی تو میں نے دیکھا کہ اپنی غلیل کے سارے کنکر نکل چکے تھے۔شش سالہ سلسلے کے ان کنکروں کو اس کھیل میں صرف ہونا تھا؟ پھر بھی سلسلے کے بطن سے کھیل کا انکھوا تو تمھارے بعد کے استفسار کی آبیاری سے پھوٹا تھا۔میں تم سے پھر نہیں پوچھوں گا کہ بیج کس نے بوئے،تم نے یا میں نے؟ ویسے میں نے تو تمھیں جواب دیا ہی تھا کہ افسوس تو لذتوں کی آخری پناہ گاہ ہے۔

''افسوس''! انھوں نے ایک گھونٹ جام کا لیتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

''زندگی ایک ایسے کھیل کا سلسلہ ہے جس کے سرے ہمیشہ سے ملے ہوتے ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کھیل کا ہر سلسلہ الگ الگ ہے۔تم پیتے نہیں ہو!''۔

میں نے ان کے جواب کونظر انداز کرتے ہوئے پھر سے اپنا سوال دہرایا، ''آخر کس تشنگی نے آپ کواس حجرے تک پہنچایا۔''

ہمارے گاؤں کی گلیاں خون سے بھرے کیچڑ سے لت پت رہتی ہیں۔ یہ خون تاریخی بھی ہے اور جغرافیائی بھی......... گاؤں سے دور کنارے ایک درگاہ ہے۔اس درگاہ کے قریب تنہا حجرے میں اکے تھکا ماندہ، مجہول، نیم غنودہ ڈھولک کی تال پر کثرت کی باتیں کرتا ہے اور وحدت کی تلقین۔

میں نے پھر سے انھیں اعداد میں الجھتے دیکھ کر ٹوکا'' آپ کو کون سی شئے اس حجرے تک لے گئی۔ کشف یا لذت؟

''40''قلم رکھتے ہوئے انھوں نے نیچے سے اوپر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
''تمھاری اور میری عمر کے فرق کونظر انداز کرتے ہوئے بھی میں تمھیں اپنی روداد سناؤں گا۔''

''میری عمر پندرہ سولہ سال کی ہوگی کہ میں نے بجلی خان کی مسجد میں قرآن کی تعلیم حاصل کی۔امام صاحب کو صبح اور شام کا کھانا پہنچانا، یہی میری فیس تھی۔میرے ساتھ اور بھی لڑکے پڑھا کرتے۔ہمارے عقائد میں امام صاحب کے اعتقادات کا بڑا دخل ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اللہ ایک ہے۔اور رزاق ہے مگر بغیر وسیلے کے اس تک کسی کی رسائی ممکن نہیں۔ حضورﷺ شافعِ محشر ہیں اس لیے ہر مسلمان بالآخر جنتی ہے۔نماز دل سے پڑھنا چاہیے۔ روزہ اور زکواۃ کے شرعی اصول سب کے لیے یکساں ہیں اور معارفانہ اصول اس کے اُلٹ ہیں۔عارف اپنے پاس کچھ نہیں رکھتا۔جس نے حج کیا اور حضورﷺ کے روضے کی زیارت کی اس کے سب گناہ معاف ہوجاتے ہیں........ان دنوں ہر جمعہ میں سلطنت آصفیہ کے عروج اور استحکام کا خطبہ بھی دکن کی ہر مسجد میں پڑھا جاتا تھا۔ہمارے گاؤں میں بھی رضا کار

تنظیم قائم تھی۔میری صحت اور امارت لائق تحسین تھی اس لیے میں بھی روزانہ پریڈ میں شامل ہوتا۔سربراہ تنظیم مملکت ہندوستان کی سیاسی ،فوجی، ریشہ دوانیوں سے واقف کراتے۔اپنی نیم فوجی ٹریننگ کے ساتھ ساتھ مجھے اپنے کھیت میں بھی کام لینا اور کرنا پڑتا تھا۔میری نوجوانی کے دن تھے اور اطراف میں کئی چراگاہیں تھیں۔ہمارے کھیت میں کئی سو آم کے درخت تھے اور آموں کا کاروبار مجھے بڑا راس آیا۔آموں کی نگہ داشت کرنا میری سب سے بڑی بابی تھی۔چناں چہ اطراف کے کئی ایک درختوں کو خریدتا رہا.......اس اثناء میں پولیس ایکشن ہوا.......... ہندوستانی فوج دکن میں داخل ہوئی۔سلطنت آصفیہ کا چراغ بغیر کسی پھونک کے بجھ گیا۔ہمیں تنظیم میں محفوظ رہنے کی ترکیبیں بتلادی گئی تھیں۔چناں چہ ہم میں بہت سے لوگ اس بلا سے بچ گئے اور غیر ٹرینڈ لوگ اس کی زد میں آ گئے۔ان دنوں قدرت بھی مہربان تھی۔لیکن میں نے آج تک کبھی ماہ ستمبر میں اتنی طوفانی بارش نہیں دیکھی۔گاؤں کے گاؤں خالی ہوئے اور لوگ باگ اطراف کھڑی فصلوں کے اندر چھپے رہے۔مجھے اپنے ایک ہندو کارکن کے گھر میں پناہ ملی........بہ ہر حال ہر قسم کے اثاثے لوٹے گئے۔امن ہوا تو لوگ سراسیمہ اور سکتے کی حالت میں تھے۔پانی کی افراط تھی مگر ہر طرف تشنگی تھی۔باؤلیاں صاف کی گئیں۔گم شدہ انسانوں کا سراغ برآمد ہوتا رہا۔گلیوں میں کھیت اگ آئے تھے۔محلے کے لوگوں نے مجھے اپنے محلے سے امن کمیٹی کا رکن منتخب کیا۔اپنی ٹوٹی پھوٹی مسجد کا امام مقرر ہوا۔میرا اپنا بہت کچھ باقی رہ گیا تھا۔پھر کانگریس کے ٹکٹ پر میونسپلٹی کا ممبر منتخب ہوا۔لاری کا کاروبار شروع کیا۔آندھرا سے مہاراشٹر چاول درآمد کرنا جان جوکھم میں ڈالنا ہوتا تھا۔پھر بھی اپنے رسوخ سے اس علاقے کو سال بھر چاول درآمد کرتا رہا۔اب گاؤں کے لوگوں نے مجھے اپنی ہر انجمن کا صدر بنانا شروع کیا۔میں ہر سال گیارہویں شریف بڑے اہتمام سے کیا کرتا تھا۔قومی انجمن

کے تحت میں نے گاؤں کی پردہ دار بچیوں کے لیے مدرسہ نسواں کی بنیاد ڈالی جواب شبانہ روز کی محنت کے بعد کالج تک پہنچ چکا ہے۔ پھر اس کے بعد میں نے عزم حج کیا۔ حج سے واپسی کے بعد لوگوں نے مجھے بتلایا کہ گاؤں کا پہلا حاجی ہوں........ کیا زندگی تھی۔'' انھوں نے لمبی سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

پھر میں نے اپنا سوال دہرایا۔

''قطرہ اور موتی کے بیچ توفیق کا سلسلہ سب سے بڑا کھیل ہے۔'' انھوں نے افسردہ لہجہ میں کہا۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''ہر اقامت گاہ میں ایک کابوس رہتا ہے جو ہماری تشنگی چوستا رہتا ہے۔''

''کون سی اقامت گاہ!''

''اس زیاں کار زندگی میں سلسلہ اور کھیل دونوں ہی رمز ہیں۔'' انھوں نے خلا میں اپنی خمار آلود آنکھیں ٹکاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اور اس کابوس کے لیے تمھیں غذا تو فراہم کرنی ہی پڑے گی اور سب سے بہتر غذا تو تم خود ہی ہو۔ اس لیے تو ڈھولک کی تال پر آواز گونجتی ہے۔ اپنے آپ کو کم کر یہاں تک کہ اقامت گاہ میں کوئی گاہ نہ رہے۔''

''اقامت گاہ!''

پتہ نہیں کون کس سے کب وابستہ ہوا۔ یہ کھیل ہے یا سلسلہ۔ میں نے سوچا املی کے درخت کے پاس میں نے اپنے مخمصے اور وہم کو اطمینان کا روپ دینے کی کوشش کی۔ ہلکی سی بوندا باندی اب بھی ہو رہی تھی۔ وہ میرا پہلا دن تھا۔

بلاوے کے اس دن مجھے اس بات کی طمانیت تھی کہ محض شکل اور صورت اور حیثیت

سے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ پھر بھی احتیاطاً میں نے وہ سارے احمقانہ ردوبدل آئینے کے مقابل کر لیے تھے۔ جو جیب میں بسی اجنبی شبیہ کو ابتدائی مرحلے میں ایک حدتک گوارہ کر سکتے تھے۔ ویسے تو میرا اصل سرمایہ تو قلم اور کلام ہے۔ میں نے بعد کے ایک موقع پر تم سے کہا تھا۔ قلم اور کلام تو مناسب آدمی کی سحر کاری کے اولین اعمال ہیں۔ یہ دن جون کا آخری دن تھا۔ جون کے مہینے میں ویسے بھی غلیلیں تنی رہتی ہیں۔ پھر برسات کی رم جھم اور سفید لباس میں ملبوس اس اجنبی کی شبیہ کے حقیقی دیدار کا اشتیاق۔ گزشتہ ایک ہفتے سے نیند ایک وہم کا نام تھی....... آج میں نے خواہ مخواہ رخصت لی۔ ویسے شام کو بھی جایا جا سکتا تھا۔ گھر میں بھی جھوٹ گھڑنا پڑا بڑی خاموشی کے ساتھ میں نے مطلوبہ راہ لینی چاہی مگر نگار نے پوچھ ہی لیا۔

''بابا کہاں؟''

اب میں اسے کیا جواب دیتا۔ پتہ نہیں مجھے کس کی تلاش ہے۔ کون سی تشنگی ایک آوارگی کے لیے دیوانگی کی حدتک اکساتی ہے۔ ایک بے نام خلا زاد سفر ہے یہ کیسی توفیق ہے؟ یہ سلسلہ ہے۔

اس پنج سالہ سلسلے میں تمھاری مستقل اقامت گاہ کی سیڑھیاں چڑھتا اور اترتا رہا۔ ہر روز املی کے درخت کا سایہ ہم سفر ہوتا ہے۔ تمازت کا کبوتر پھڑ پھڑاتا مگر غلیل تنی ہی رہتی۔

مرکزی اقامت گاہ میں جو کچھ ہوا اس سے کون وابستہ ہوا ہے؟ میں سوچتا ہوں یہ تو ایک کھیل ہے لیکن تمھیں سلسلہ دکھائی دیتا ہے اور میں اسے سلسلہ کہنے پر مصر ہوں تو تمھیں سب کچھ کھیل لگتا ہے۔

گاؤں کے تنہا حجرے میں بوڑھا کہتا ہے۔

''اپنے آپ کو کم کر۔ اقامت گاہ تو ایک ہی ہے۔ جہاں کوئی گاہ نہیں۔''

خمار میں ڈوبی ہوئی آواز میں میں انھیں جواب دیتا ہوں۔ ''جناب! کیا ہر سلسلہ تو کھیل نہیں؟''
●●

اندوختہ

"زندگی قرض ہے....... مگر اسے سود کے ساتھ کیوں چکایا جائے؟"......

آنکھیں اوپر اُٹھائیں، کوئی نہ تھا، میرا اوہم بھی نہیں۔ نساء، تو کب کی جا چکی۔ تاج زینہ کی دیوار پر ارجنا آرک کا سایہ اب بھی متحرک ہے۔ معمولی ہواؤں سے لپکنے والا۔ آج تو اوپر بڑی تیز ہوائیں چل رہی ہیں۔ نیچے کے حبس سے تنگ آ کر ہی میں نے چھت پر بستر لگوایا تھا۔ صبح سفر پر نکلنا ہے۔ بیگ میں تمام کاغذات سلسلہ سے رکھ دیے تھے۔

ان کاغذات ہی کے لیے ہی تو اتنا سب کچھ اُلٹ پلٹ ہوا تھا۔ عجیب بات ہے۔ ان کو جمع کرنے کے لیے کاوشیں اور چھٹکارا پانے کے لیے جدوجہد۔ میں نے کب ایسا چاہا تھا، بس اپنی چھوٹی سی من پسند زندگی گزار نہ پانا ہی سب سے بڑا المیہ ہے...... اب تو اندوختہ سرہانے رکھ لیا ہے۔ آسمان پر چھتناری پتیاں پھیل گئی تھیں۔ نویں رات کے چاندکی کرنوں اور تیز ہواؤں کی لہروں پر سوار اونگھتی ہوئی ہلکی دھم سے بستر پر آ گری۔ ارجنا آرک کا

سایہ شہر کی بیزار کن روشنیوں پر محیط ہو چکا تھا........

متعلقہ کمرہ میں میں نے اُن سے کہا:

''مجھے یہ سب معلوم نہ تھا۔''

''آپ کو شرائط کی نقل دے دی گئی تھی۔''

''میں نے اسے پڑھا نہیں۔''

''یہ ہمارا مسئلہ نہیں۔''

''تو اب کوئی ایسی صورت نہیں کہ مجھے دوسری؟''

''آپ کے پاس کوئی تیسری ہے؟''

مجھے چھٹکارا ملنے کی آس بندھتی محسوس ہوئی۔ بیگ کھولا اور کاغذ تیسرے خانے سے نکال کر ٹیبل پر رکھ دیا۔ انھوں نے اسے غور سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے میری طرف سرکا دیا۔

''آپ ایک ماہ سے پیچھے رہ گئے۔''

''یعنی.......؟''

''ہم تین سال کے بعد ہی غور کر سکتے ہیں۔''

''تو پھر.......؟''

''فی الحال کچھ نہیں ہو سکتا........ہاں ایک صورت ہے۔ آپ پہلی فہرست پھر دوبارہ طلب کر سکتے ہیں اور اس کے عوض میں دوسری لے جا سکتے ہیں۔''

''یعنی پہلی آپ کے حوالے کرنا ہو گی......؟ یہ تو........''

''عجیب گورکھ دھندا ہے نا۔''............ انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔''عارضی مشکل کو کشٹ مت سمجھئے۔ تاریخیں یاد نہ رکھنے سے اُلجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔''

میں نے کب اُلجھنیں چاہی تھیں۔ میں انھیں کیا بتاتا۔ سارا معاملہ ہی اپنے اختیار میں نہ تھا۔ کیسی اُتھل پتھل ہوئی تھی۔ زندگیوں کی ضمانت میں اپنے چھوٹے سے اُصول کو ٹوٹتے دیکھ کر.......... یہاں اس دلدل سے نکلنے کی کوئی صورت بھی ہے؟ مجھے تو اس وقت بھی جناب کی بات یاد آئی تھی۔

''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انھیں جنت اتنی آسانی سے مل جائے گی۔ ابھی تو ہم نے انھیں مال، اولاد اور عورت سے آزمایا نہیں ہے۔''

میں نے اپنا اندوختہ سنبھالا اور مزید کاغذات بیگ میں ٹھونس کر سیڑھیاں اُترنے لگا۔ سورج اوپر آچکا تھا۔ پھاٹک سے ایکسٹنشن روڈ کی دونوں جانب ارجنا آرک کے سائے جھلملا رہے تھے۔ مین روڈ پر ٹریفک شباب پر ہے۔ لیکن مجھے وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ بیگ کھول کر شناخت نامہ اور وجہ ملاقات کی نوٹس دکھائی اور ہال میں داخل ہوا۔

انھوں نے بیٹھنے کے لیے کہا۔ کھڑکی کی سلاخیں ٹیبل پر سایہ فگن تھیں۔ لیکن تمازت کو اے سی نے رخصت کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات سے نظریں اُٹھائیں اور مخاطب ہوئے۔

''اس ضمن میں ہمارے پاس کئی مراکز اور متعلقہ افراد سے شکایتیں ملی ہیں کہ.....''

''مگر وہ سب غلط ہیں۔''

''آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس ضمن میں جو غیر ذمہ داری آپ سے سرزد ہوئی ہے اور جس کے نتیجے میں جو پریشانی اور نقصان ہوا ہے، اس کا محاسبہ کیا جانا ابھی باقی ہے۔''

''آپ کا مفروضہ صحیح نہیں ہے۔''

''ہمارا؟ اس باب میں اتھارٹی نے بھی سخت نوٹس لیا ہے جن میں کئی ماہرین بھی

شامل ہیں۔''

''غالباً انھوں نے میرے Version سے اس کا تقابل ہی نہیں کیا ہے۔''

وہ تو انکوائری کمیٹی کرے گی مگر میں چوں کہ آپ سے..... تم سے اس حالت.....

میرا مطلب ہے تم کسی ذہنی یا گھریلو مسئلہ میں اُلجھے ہوئے تھے؟''

''ان سب باتوں کا اس سے کیا تعلق؟''

''ان دنوں مجھے تمھارے ہاں سے شادی کا دعوت نامہ ملا تھا۔ اپنے کالج میٹ کے ہاں خوشی کے اس موقع پر شریک نہ ہونے کا افسوس بھی ہوا تھا۔ بہر حال مبارکباد۔''

''شکریہ۔ اس نے بھی وداعی تقریب میں تمھیں یاد کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ان دنوں میں بہت سرگرداں رہا۔ ساری دوڑ دھوپ مجھے ہی کرنی تھی۔''

''Look........ اس کاغذ پر اپنے دستخط کر دو۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔''

''کیا ہے یہ؟''

''Apology Letter''

''مگر کیوں؟۔ میں نے کیا ہی کیا ہے؟''

''سوالات نصاب سے تجاوز کر گئے تھے۔ مگر میں نے اس لیٹر میں بڑی محنت اور ہوشیاری سے ایک Genuine Excuse کو شامل کیا ہے........ تم پڑھو تو سہی۔''

میں نے کاغذ لے کر پڑھا اور خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''یہ غلط توضیح ہے۔ میں اپنے گھریلو مسائل اور پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کو الگ الگ خانوں میں رکھتا ہوں۔''

''میری بات مانو۔ زندگی میں Compromise سب سے بڑی قدر ہے۔''

کاغذلوٹاتے "Absolutely not. I shal face the enquiry"
ہوئے میں سیٹ سے اُٹھا۔سوچنے لگا۔"کیا واقعی اُصولوں کے ٹوٹنے میں اللہ ہی کارسازی کرتا ہے؟ایسی رائے قائم کرنے میں کتنی راحت ہے۔"

باہر نکلا تو سورج سر پر آچکا تھا۔سامنے لان میں ارجنا آرک کے سائے سرنگوں ہوگئے تھے۔

"سپرنٹنڈنٹ صاحب آپ کو یاد کرر ہے ہیں۔"،چاروناچار جانا ہی پڑا۔

"بعدمدت حضور کے درشن ہور ہے ہیں۔اپنے احوال ہمیں بھی تو سنایئے۔"

"کام کی بات کرو۔مجھے جلدی ہے۔"

"بس وحید صاحب آپ کو ہر معاملہ میں جلدی ہوتی ہے مگر جو تحفہ ہم آپ کو عنایت کرنے........."

"تحفہ؟ کیسا تحفہ؟"

"نساءکا مارکس کارڈ۔"

"مگراس انے امتحان ہی نہیں دیا تو مارکس کارڈ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"کیا خوب.........اس سادگی پر کون نہ مرجائے اے خدا۔اس کاغذ پراپنا نام پتہ اور دستخط اگر چہ یہ قواعد کے خلاف ہے مگر ہم ٹھہرے محبت کے دیوانے........ آپ کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے.........یہ رہا مارکس کارڈ......... مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نامہ بر کو میں........."

میں نے حیرت سے کارڈ لیا اور کھو گیا.........

زم زم چورا ہے پر ہم دونوں کی زم زم دیدہ بازی ہوتی۔نساءروٹ 4 پر سفر کرتی اور

میری کوئی روٹ مقرر نہ تھی۔اس کی چوکیداری میں زمانے بھر کا لطف تھا۔میں اسے خوب صورت تو نہیں کہہ سکتا مگر اسے دیکھتے ہی مجھے اپنی ماں کا چہرہ یاد آتا....... عجب ممتا بھرا چہرہ....... نور سے بھرا گورا رنگ بڑی بڑی گول آنکھیں جن میں آسمان کی نیلاہٹ منعکس ہوتی۔سراپا ایسا کہ بھینچ لینے سے زیادہ چھونے میں سرور آئے۔ہم دونوں کی عمروں میں تفاوت تھا۔اس میں استقلال کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور میں پارہ نصیب۔کئی ملاقاتوں کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ کس طرح تین ماہ پہلے فسادات کے بعد پولیس نے شہر کے اسی چوراہے پر اس کے بڑے بھائی کو گھیر کر گولیوں سے بھون دیا اور بعد میں اسے انکاؤنٹر کا نام دے دیا....... وہ مجھ سے کسی قسم کا مطالبہ نہ کرتی بلکہ بات بھی کم کم ہی کرتی ،مگر میں اپنے طور پر اس کے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتا تھا۔مختلف قسم کے فارم بھر دینا، پراکٹیکل ریکارڈ بک میں شکلیں اُتارنا، لائبریری سے کتابیں لانا، بس پاس کے لیے دوڑ لگانا....... اور اس کی ایسی سب ضرورتیں پوری کرنے میں مجھے عجیب سی مسرت ملتی تھی۔پھر ایک دن ایسا ہوا کہ سب کچھ بدل گیا۔ایک آدمی کی روزمرہ تبدیلیوں میں یا تو اسے بیوی مل جاتی ہے یا نوکری....... زمانہ گزر گیا....... نساء کی خبر ہی نہیں ملی بلکہ میں نے جاننے کی کوشش بھی شاید نہیں کی تھی.......

ایک دن: نواب جلال خاں صاحب کی نوٹس آئی۔وہ ہماری سابقہ جاگیر کے متوقع جانشین تھے مگر پولیس ایکشن کے باعث وہ اپنے حق توارث سے محروم ہو گئے تھے۔ان کے والد نواب سید احتشام خان صاحب کو بھی بڑی حکمت عملی سے والی جاگیر بنایا گیا تھا۔ان کے والد سید مکرم خاں صاحب کی اور جاگیرداروں کی طرح چار بیویوں کے علاوہ، بیسیوں کنیزیں تھیں،انھوں نے حسبِ دستور اپنے بڑے فرزند نواب سید رضی خاں کو اپنا جانشین مقرر کیا اور اس کی توثیق والیٔ ریاست سے بھی حاصل کرائی گئی تھی۔

نواب رضی کو کشتی رانی کا شوق تھا۔ایک شام وہ اپنے مصاحبوں اور محبوبوں کے ہم راہ جاگیر کے دریا میں کشتی رانی کا لطف اُٹھا رہے تھے کہ اچانک کشتی ڈوب گئی۔ایک ماہر تیراک کے علاوہ سب ڈوب گئے۔تیراک نے نواب کو بچانے کی کوشش کی مگر وہی یہ خبر سنانے کے لیے زندہ رہا۔بعد ازاں نواب احتشام کو حسبِ دستور والیٔ جاگیر بننا پڑا۔نواب صاحب نے ماہر تیراک کو اس کی خدمات کے عوض کئی ایکڑ زمین انعام میں عطا کی۔ ... پولیس ایکشن میں نواب احتشام کو کسی نے بڑی بے دردی سے قتل کیا۔ان کی خون میں لتھڑی لاش کے اطراف کاغذات کا انبار تھا۔خون سے سنی مٹھی سے کاغذات کو بڑی مشکل سے نکالا گیا۔جاگیر ختم ہوئی۔ریاست ٹوٹ گئی۔اثاثے لوٹے گئے۔عورتیں غائب ہوئیں۔اس پرآشوب دور کے پانچ سال بعد نواب سید جلال خاں صاحب سابقہ ریاست کی راجدھانی حیدرآباد سے اپنی آبائی جاگیر تشریف لائے اور اپنی جاگیر کی باقیات کے حصول میں جٹ گئے۔

نواب سید جلال خان نے شبانہ روز کی محنت سے اپنی سابقہ جاگیر کے ریکارڈ جمع کیے۔ان کا ریکارڈ روم ان کی محنت شاقہ کا جیتا جاگتا نمونہ ہے........نواب نے اپنے محلات میں کئی اسکول اور کالج قائم کیے اور اس طرح ان عمارات کے تحفظ کا بندوبست کر لیا ورنہ موجودہ حکومت کے محکمہ آثار قدیمہ کو ان عمارات میں اپنے دفاتر اور میوزیم قائم کرنے کی عجلت تھی۔ نواب نے اپنا ٹرسٹ قائم کیا۔ایک سیکولر پارٹی کے جھنڈے تلے الیکشن لڑا اور شہر کے چیئرمین منتخب ہوئے۔محرم کے تعزیے پھر سے دھوم دھام سے نکلنے لگے۔صوفیوں کے تارک الدنیا حجروں میں سماع کی محفلیں آراستہ ہونے لگیں۔عرس اور سالانہ مشاعرے جاگ اُٹھے۔ایسا فعال نواب میرے دیکھنے میں کم ہی آیا۔انھوں نے مجھے اپنے تعلیمی اداروں کا سیکریٹری مقرر کیا۔ان کی وہ نوٹس ٹیچرس کے تقررات کے باب میں تھی..........

انٹرویو میں نساء کو ایک مدت بعد دیکھا۔نواب نے میرے کچھ کہنے سے قبل ہی نساء کا تقرر کردیا۔اب پھر وہی دیوانگی........ میں طرح طرح کے بہانوں سے نساء کے آگے پیچھے سرگرداں رہا۔میرے لیے یہ نئی بات تھی کہ نواب موصوف بھی اسکول پر مسلسل حاضری دینے لگے۔نساء نے ایک دن اپنے اندیشے کا اظہار بھی کیا۔میں نے اسے تسلی دی اور تحفظ کا احساس بھی دلایا مگر اس نے ایک سال کے اندر ہی اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔میں نواب صاحب کے پاس طیش کے عالم میں پہنچا۔

''نواب صاحب یہ سب کیوں ہوا؟''

''وہ ایک بار پھر میرے ہاتھوں سے نکل گئی۔''

''آپ بڑی خراب مثال قائم کررہے ہیں۔''

''وہ ہماری جاگیر ہے۔''نواب نے کہا''اور جو کوئی ہمارے اس حق کے بیچ آتا ہے، ہم اسے غائب کردیتے ہیں۔''

میں نے اپنا استعفیٰ بھیج دیا مگر انھوں نے مجھے برطرف کیے جانے کا پیغام بھیجا۔ایک زمانہ گزر گیا۔نساء کی کوئی خبر نہیں تھی بلکہ میں نے شاید جاننے کوشش ہی نہیں کی تھی......اور اب یہ مارکس کارڈ!

میں کارڈ کو اپنے اندوختہ میں رکھتے ہوئے جب عمارت سے باہر نکلا تو ارجنا آرک کے سائے طویل ہوگئے تھے۔

وہی دورویہ گلی....... مگر بہت کچھ بدل بھی گیا تھا۔چراغ مسجد کی ریلنگ کے سہارے دور تک جانے والی گلی Upper Lane اور ریلنگ سے نیچے دور تک جانے والی گلی Lower Lane کہلاتی تھی۔اب دونوں جگہوں پر کولتار کی سڑک گلیوں کی آخری سرے تک

دکھائی دے رہی تھی۔ جگہ جگہ بڑی بڑی عمارتوں نے سر اُٹھا رکھے ہیں۔ مجھے یاد تھا۔ تھوڑی ہی دور ارجنا آرک کا طویل درخت اور اس سے متصل پتلی گلی میں نساء کا مکان ہے.... میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ شام پوری طرح پھیل چکی تھی۔

''آپ کا نام''.......... ایک دس گیارہ سال کا لڑکا مجھ سے ہم کلام تھا۔ اس کی نظریں میرے بیگ پر ٹکی تھیں۔

میں نے اپنا نام بتایا۔

لڑکا چونکا اور تھوڑا سا مسکرایا۔

''آپ جا گیر سے آرہے ہیں؟ نواب انکل کیوں نہیں آئے؟ آپ ان کا پیغام لائے ہیں؟''

لڑکا پارہ صفت لگا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''آپ بھی ممی کے کالج میں پڑھاتے ہیں یا پاپا کے دوست ہیں؟''

میرے جواب سے پہلے ہی دروازے کا دوسرا پٹ کھلا۔ نساء کے چہرہ پر حیرت آمیز مسرت تھی۔ وہی سراپا...... میک اپ سے عاری چہرہ۔ بالوں میں دو سفید پٹیاں فوری طور پر متوجہ کرتی تھیں۔ میں اس کے بلانے پر کمرہ میں داخل ہوا۔ ایک لانبی میز پر چائے کی پیالیاں بسکٹ اور فروٹ بکھرے پڑے تھے۔

میں نے اپنا بیگ کھولا اور اوپری خانہ سے اس کا مارکس کارڈ نکالا۔

''مبارکباد۔''

کارڈ پر نظریں گاڑتے ہوئے اس نے کہا۔ ''آج میرے لیے خوشیوں کا دن

ہے۔'' پھر بولی۔'' آج ہی میرا Promotion بھی ہوا ہے۔نواب صاحب نے زبردستی یہ پارٹی ارینج کروائی تھی مگر وہ.........ابھی تک نہیں آئے؟''

میں کچھ بھی کہہ نہ سکا۔

وہ میری خاطر مدارت میں ادھر اُدھر اندر باہر ہوتی رہی۔ میں اس کی باتیں سنتا رہا۔ پچھلے دروازے پر ہلکی سی آہٹ کے ساتھ ہی اس نے کہا۔

''غالباً نواب صاحب تشریف لائے ہیں۔''

میں نے رخصت چاہی۔اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی۔دروازے پر اس نے مجھے غور سے دیکھا اور ایک چِٹ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''اسے گھر پر پڑھیے گا۔''

میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔کسی اور کمرہ سے لڑکے کے ہنسنے کی آواز میرا پیچھا کرتی رہی۔ رات کے آثار واضح ہو چکے تھے۔ارجنا آرک دھندلا گیا تھا۔مسجد کے صحن میں لگے لائٹ پول میں، ریلنگ کا سہارا لیے میں نے کاغذ کھولا اور پڑھنے لگا۔

''جناب۔آپ نے مجھے ہمیشہ خوشیاں پہنچائی ہیں۔مگر آپ سے ایک گلہ ہے۔ آپ نے ،اپنے ہاں کی شادی میں مجھے یاد نہ کیا۔نواب صاحب سے مجھے اس کی اطلاع ملی تھی۔کتنا بدل گیا ہے وہ شخص۔ مجھے کبھی کبھی تو یہ احساس ہونے لگتا کہ کہیں آپ کی روح تو ان میں نہیں سما گئی؟ آپ نے ان دنوں مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا زندگی محض جنگ ہی نہیں صلح بھی ہے۔نواب صاحب نے وقت سے سمجھوتہ کرلیا ہے۔آج مجھے احساس ہوتا ہے، ان کی رعونت ان کی پژمردہ شکستگی کا ردعمل تھی۔گھر میں سب کو سلام کہیے گا۔بیٹی کو ڈھیروں پیار اور دعائیں۔کیا وہ آپ کے ہاں آئی ہے یا سسرال میں ہے؟ نساء۔

''نوٹ۔طارق سے آپ کے آنے کا ذکر کروں گی۔طارق وحید کے ابّو کا نام ہے۔''

مجھے گول گول گہری آنکھوں سے آسمان کی سی نیلاہٹ فضا میں منعکس ہوتی ہوئی محسوس ہوئی.........

آسمان ابھی دھندلا تھا۔میں نے اپنی سب چیزیں سمیٹیں۔اندوختہ سنبھالا۔لائٹ آف کی۔میں وقت پر جاگ گیا تھا۔سیڑھیوں سے اُترا،ہاتھ منہ دھویا،لباس تبدیل کیا اور بیگ سنبھالتا دروازہ کی طرف بڑھا۔صبح ہو چکی تھی۔

''بابا کب تک لوٹیں گے؟'' پیچھے سے نساء کی آواز آئی۔میں نے بغیر مڑے جواب دیا۔''شام تک''۔ ●●

زوالِ رفت میں پچھلی دُھند

(قمر احسن کے نام)

سقوط شب، ہاں ہاں یہی۔

اب میں تم سے بہت بہت ہی دور، سقوط شب کے زوال میں بہت تیز چبھتے لال سنگ ریزوں سے لاپرواہ، قریب سے قریب تر ہو رہا ہوں۔ وہاں کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔

ہاں سقوط شب کا داستانی حصار تمھاری مسکراتی آنکھوں سے طلوع ہوا تھا۔ کیسا عجب تھا وہ؟

پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اور کس طرح اس عدم خودکار جھولے میں ہچکولے لیتا سب سے اوپر پنگوڑے میں پہنچا۔ اس چکر پر میرا اختیار کب تھا۔ میں نے زمین دیکھنے میں بہت سی جدوجہد یں کیں مگر تھاہ کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ گھنگور آسمان پر سورج بھی آنکھ مچولی میں غلطاں۔

اطراف نظریں دوڑائیں تو محسوس ہوا کہ شاہ علی بندہ یا آغا پورہ کا محل وقوع ہے۔ اطمینان کی سانس بھی لینے نہ پایا تھا کہ جھولا پھر سے حرکت میں آ گیا اور میں نیچے ہی نیچے اور بہت ہی نیچے اور بہت بہت ہی نیچے آتا رہا۔ سارا محل وقوع اوجھل ہوتا گیا اور ایسا لگ رہا تھا کہ میں ایک وسیع و عریض فولاد کی ٹنکی میں اُتر رہا ہوں۔ اوپر کے سارے منظر غائب۔ سخت سفید اور شفاف سطح کے کچھ اور دکھائی نہ دیتا تھا۔ آخر کار ہنگوڑا، چند ہی انچ اوپر سخت دھات نما سطح پر جھولتا رہا۔ ٹنکی کے اوپر کونوں اور دیواروں سے عزیز احباب کی نرم گرم آوازیں ابھرتی رہیں۔ عجب دھات نما آوازیں، مجھے یاد آیا۔ جب دیہات کے عرس میں تمھارے انتظار سے اکتا جاتا تو بلا تاخیر جھولے سے اُتر جاتا سامنے راستے کے چڑھاؤ کے نیچے آوازوں کی بستی میں تمھارے وجود کا سناٹا میرے دل میں اُترتا رہتا اور یہاں۔ اطراف چنبیلی کے پھولوں کے گجرے اور رس بھری آوازیں گونج رہی تھیں۔ تمھیں یاد ہے ایسے ہی ایک موقع پر تم نے پھولوں کو ترجیح دی تھی..... پھر یہ کیسے ہوا۔ کیوں؟ اس عدم خودکار جھولے پر کسی کا بھی اختیار نہیں۔ مجھے جب اوپر لایا گیا تو میرا دوست ٹکٹکی لگائے مجھے ہی گھور رہا تھا۔ آج کل وہ کسی شعبہ میں سیکیورٹی کام پر متعین ہے اس نے مجھے کھینچا۔

''میرا دل ڈوب رہا ہے۔''

جسم پر بڑی تھکن تھی۔ مجھ کو باور کرایا گیا کہ اس حصار آسا سفر کے بعد میں بالکل بیمار ہو چکا ہوں۔ آسمان پر سورج اپنا غسل آثار بدن پونچھنے میں مصروف تھا۔ ایک شخص جو سابق میں مشہور فزیشین اور اب روحانی علاج کی طرف راغب ہے میرا معائنہ کرتا رہا بعد ازاں اس نے مجھے کچھ تصاویر دکھلائیں۔ ہرے بھرے کھیت، ٹوٹے مکان، انار کے درخت سے نکلتا ہوا دھواں، کچھ اَن بجھے نقوش، زرد چہرہ، لال مٹی...... نسخہ کی چٹھی میرے دوست کے

حوالے کرتے ہوئے اس نے کہا" فی الحال کسی آزاد پرندہ کا جوڑا نہیں دکھلایئے۔ حصار کی گہرائی نے ان سے ان کا محل وقوع گم کر دیا ہے۔"

کیسا عجیب تھا وہ داستانی حصار، تمھاری مسکراتی آنکھوں سے طلوع ہوتا ہوا۔ میری روح پر اس کے غروب ہونے کی داستان" میں یہ سب تمھیں سنا رہا ہوں۔ سنتی ہو نا۔"

میں نے ہلکی تمازت والی صبحوں میں آوازیں دیں مگر پانی پر سفر کرتے سایہ کو مقید کرنے کے لیے کون سا جال میرے پاس تھا........ اور وہ اپریل کی چودہ تاریخ تھی۔

شروع شروع میں میں نے تمھارے راستوں پر کتنے قسم کے پھول بکھرائے تھے۔ ان پھولوں کے حصول میں آوارگی میری واحد سرگرمی تھی۔ نیلے مہربان آسمان کے نیچے، درگاہ سے کتنی دور تھا وہ مکان، تمھارا مکان، سیاہ گول گول آنکھوں کے بیچ منتظر فاصلوں کی صبحوں میں سفید پھولوں کی خوشبو انتظار کی آخری کمین گاہ تھی۔ یہاں تک کہ تمھارا دروازہ آ جاتا۔ وہاں کیا تھا۔" حصار"۔ ایک دن کاروباری روابط کا لفافہ کھولتے ہوئے دکھائی دیا۔" آدمی کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ عورت کی بجائے میدانوں میں نکل جائے۔"

تم نے میرے جواب کو نیم غنودگی میں سنا۔ میں نے ہلکے، دھیرے دھیرے اور نرم انداز سے تمھارے چہرہ سے تر بہ تر زلفوں کو ہٹایا۔ ماحول بڑا جاگا جاگا سا محسوس ہوا۔ سامنے ادھ کھلی کھڑکی ہے۔ دائیں جانب دور درگاہ کے کلغی نما کلس میں سبز روشنی، تھکی تھکی بارش، انار کے درخت میں شعلے بھر رہی تھی اور دور چاند ڈول رہا تھا۔ میں نے تمھارے نرم اور گداز جسم کو ہلکی سی کپکپاہٹ کے ساتھ سخت ہوتا محسوس کیا۔

"عرفانہ"!

"کیا؟ یہ کیا نام؟" ایک سوالیہ وجود۔ سیاہ نرم بالوں میں بکھرتا چاند۔

''.......نام''،مولسری کے درخت کی سمت دھواں اُچھالتے ہوئے اس سبز عباپوش فقیر نے جواب دیا.........سن چھوکرے۔اللہ۔ابلیس۔آدم گٹھ......تینوں کا بس ایک ہی مٹھ''

''میں نے ایک خواب دیکھا ہے؟''

''کب؟''

''کوئی چھ روز پہلے........شاید نو اپریل کی صبح''۔

......تو ہوا یہ کہ دن پوری طرح روشن تھا میں اپنے کھیتوں میں حیران سرگرداں، چاروں طرف نظریں دوڑائیں جام کے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ کھڑے تھے۔کل شام ہی تو ہزاروں جام گنے جا چکے تھے۔اب کے اور کوئی ان ہونی وبا۔میرے دل میں وہی خوف اُبھر آیا۔میں نے سامنے دیکھا دھند میں وہ آگے بڑھ رہا تھا۔وہی جو ہمیشہ سے میرے تعاقب میں چکراتا رہتا ہے۔عدم خود کار۔میں نے اپنے کالے کرتے کی جیب میں شجرۂ اطاعت کی سرسراہٹ محسوس کی۔کس قدر اچھی حالت میں تھا وہ۔پرسوں شام جب حساس جائے واردات پر، بے تحاشہ جام لنڈھانے کی پاداش میں وہ سب میرے خلاف غل مچا رہے تھے۔تب آڈیٹوریم میں کوئی بھی میری داستان سننے کو تیار نہ تھا۔ایک مسخرہ نے اپنے کرتب نما کارنامے سے مجھے بچالیا۔آڈیٹوریم میں قہقہے گونجتے رہے۔

کالے گھوڑے پر سوار میں ہوا سے باتیں کرتا رہا۔ایک حصار سے نکل کر میں موٹے موٹے سرخ منکوں والوں کے بیچ داستان سمجھانے پر مامور ہوا۔وہیں تم نے مجھے اپنی گول گول آنکھوں سے داستان حصار کا اولین سبق دیا۔ہر شام کالا گھوڑا میرا مونس تھا۔ براہواس دن کا کہ مندر کے عقب میں ایک تالاب ہوا کرتا تھا میں نے باگ کھینچتے ہوئے حالاں کہ اس سے

درخواست کی کہ وہ کم از کم چند چھنوں کے لیے سہی اپنے آپ کو گردن تک ڈبوئے رکھے مگر وہ تن کر، بدستور اپنے اشتعال انگیز عریاں سینے کے ساتھ ایسے ہی کھڑی رہی اور یوں نشہ اس کے بدن میں موجزن ہونے پر راغب ہوا۔ ساحل کی کنکریلی ریت پر جب میرے جسم پر .... منکوں والوں کے ڈنڈے برسنے لگے تب سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہوش آیا تو سبز عبا پوش فقیر نے داستان کو توڑتے ہوئے ایک نئی منزل کی طرف اشارہ کیا۔

''اپنے کفر کی شہادت سالک کے مسلک کا آخری وقوعہ ہے۔''

پشیمانی کا اطمینان ہوا تو میں ان سے بھاگنا نہ چاہا۔ ہم راہ چلتے چلتے جب ہم اشارہ گاہ تک پہنچے تو طویل لامحدود حصار کے بیچ وہ ایستادہ تھی۔ دودھیا زمانہ نے اس سنگی عمارت پر کیسے کیسے نشان ثبت کر رکھے تھے۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ آسمان صاف اور زمین پر دور دور تک کسی سائے کا نام و نشان نہ تھا۔ دروازے کے چوکھٹے میں ایک نیم شکستہ تختی پیوست تھی۔ ''فان منزل'' بقیہ حصہ پتہ نہیں کہاں کھو گیا تھا۔ وہ اس کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اندر داخل ہوا اور اچانک سردی کا احساس غالب ہوا۔ لاتعداد ستون، عمارت کا اختتام نظروں سے اوجھل ہے۔ میں نے اس سے کہا۔''

یہی ہے وہ دائرہ نما کنواں جو نویں ستون کے بائیں طرف واقع ہے۔''

صاف شفاف پانی یوں موسم اور سفر نے میری آنکھوں میں شدید لاحاصلی کا فیض منعکس کر دیا تھا۔ میں نے اندر جھانکتے ہوئے بے اختیار کہا۔

''صرف تین ہی مچھلیاں!!!''

''جب کوئی حصار نہ تھا تو تو کہاں تھا؟'' اس نے جواب میں کہا۔

''مٹھ........ گھ........''

........تو تمھیں چھ دن بعد خیال آیا کہ خواب سنایا جائے۔کیا خواب تھا وہ۔اس کے لہجے میں حد درجہ استفہام تھا۔

''میں بہت پہلے سے اس خدشہ میں مبتلا رہی ہوں کہ آخر کار یہ بوڑھے،فقیر اور وہ سب تمھیں ذہنی فتور میں گرفتار کرادیں گے۔''

میری بانہوں کے حلقہ سے آزاد ہوتے ہوئے اس نے جھلاتے ہوئے لہجہ میں کہا۔''میں خواب کے بارے میں پوچھ رہی ہوں اور تم جواب دیتے ہو،اس ادھ کھلی کھڑکی کے باہر ایک سنگین حصار ہمارا منتظر ہے؟ وہ یک بہ یک کھڑی ہوگئی۔میں نے اپنی تر بہ تر قمیص کو دیکھا۔آج میں کافی سیر کر چکا تھا دراصل کوئی بھی سیدھی اونچی نوکیلی شئے مجھے دیوانہ بنادیتی ہے۔

حالاں کہ ابھی کوئی زیادہ فاصلہ طے نہیں ہوا تھا۔سرما کا موسم اور کولتار کی ٹھنڈی سڑک دور دور پھیلی ہوئی نیم نمو فصلیں اور ان کے بیچ سویا ہوا نیم بے ہوش پانی اطراف کی سب باؤلیاں کھارے پانی کی تھیں۔صرف پیچھے،کچی سڑک سے متصل'' کھلے سر کی باؤلی'' میٹھے پانی کے لیے مشہور تھی۔سامنے سرخ رنگ کی اونچی نوکیلی سیدھی مختصر سی پہاڑی،ایک نظر میں ایسا محسوس ہوتا کہ زمین نے اپنا بھیانک روپ اس پہاڑی میں منعکس کر دیا ہو۔

''میری عمر تم سے کوئی چالیس سال زائد ہے،پھر بھی زمین کی یہ سرخی کس ہولناک تجربہ کی نشانی ہے۔میں بیان کرنے سے قاصر ہوں میں نے ذرا آگے جا کر ان کی بات سنی۔ اب آسمان کی تمازت کا جال دھیرے دھیرے کھل رہا تھا پھر بھی انھوں نے اب تک اپنے دونوں ہاتھ جیکٹ میں چھپا رکھے تھے۔دور تک کسان لال زمین کے کھیتوں میں جبر آمیز مشقت میں سرگرداں،آسمان پر نیلی نیلی شعاعوں کا مونتاژ پہاڑی کے عقب سے سارے

ماحول پر محیط ہو گیا تھا۔خالق کی فن کاری کا حصار جیسے سب پر محیط۔

''ہوسکتا ہے وہ تمام واقعی خطرناک غدار رہے ہوں جنھیں اس پہاڑی کے اوپر باندھ کر توپ سے اُڑا دیا جاتا تھا۔عبرت کے لیے........ سقوط شب کی اولین ساعتوں میں ،جب سورج اپنی آنکھیں اس زمین پر کھولتا ہوگا تب اس سرخ پہاڑی کے اوپر فضا میں اچھلتے سرخ سرخ جسم کے ٹکڑے سارے منظر کو روح فرسا بناتے ہوں گے۔''

''غدار!'' یہ لفظ تو آدم کا سایہ ہے۔تم بھی کیا اہلِ تخت کی طرح یہی سمجھتے ہو کہ پہاڑی اٹل ہے۔نہیں۔نئی حکایتیں اپنے معانی خود ساتھ لاتی ہیں۔ یہ سب اس کا کھیل ہے کہ وہ خود زمانہ ہے۔''

زمانہ....... میں نے وحشیانہ انداز سے اس کی سرخیاں چوسیں۔اُف،تم نے ابھی ابھی چراغ جلایا تھا مگر تمھارے جسم سے نکلتی روشنی میں میں اپنی روح کے اندھیرے کے ساتھ تمھارے اندر گوشہ نشین ہوں۔خوف ناک سیاہ رنگین حصار تمھارے اس بوسیدہ دروازے کے باہر میرا منتظر ہے۔تم چاہو تو اس حصار کو توڑے ہم آوارہ آزاد نکل جائیں۔سفر لمبا نہیں اور تب تمھیں زمانہ کا احساس قطعی نہیں ہوگا۔

''ٹھیک ہے۔''یوں اس لمحہ ہم دونوں اس بھورے پتھر پر بیٹھے ایک ساتھ سرخ پہاڑی کے وقوعہ پر باتیں کررہے ہیں مگر صاف سیدھی صاف حقیقت یہ ہے کہ اس بھورے پتھر کو مجھ سے پہلے آپ نے دیکھا ہے۔گرما کی انتہائی سرد راتوں بارش کی دہشت ناک دھوپ اور سرما کی بگولہ اُڑاتی شاموں میں...... اور یہ سب تجربہ ہیں۔'' مرا لہجہ حملہ آور تھا۔

''تم غالباً عمر کی بات کررہے ہو۔''انھوں نے ایک تیز جاتی ہوئی کار پر اپنی نظریں جماتے ہوئے بات جاری رکھی۔''اور اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ میں نے اس بھورے پتھر کو آج

ہی دیکھا ہے تو کیا اس کا وجود مشکوک ہو جائے گا؟اور ہماری عمر محض گمان نہیں۔وقت کا انسلاک ہم سے ہےاور ہم سے ہٹ کر وہ عدم ہے۔"

"میں سمجھا نہیں"

تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ کل جمعہ ہے۔ٹھیک ہے۔اگر انسلاکِ وقت کی حقیقت بس اتنی ہے کہ آج جمعرات ہے تو میرا اور تمھارا اس بھورے پتھر پر بحث کرنا لایعنی ہے۔انھوں نے اپنی آنکھیں سرخ پہاڑی پر جماتے ہوئے کہا۔"میں جس گاؤں میں تھا وہاں کے لوگ اس عالم ویران میں بس دو ہی کام کرتے تھے، باؤلیاں کھودتے اور اناج اُگاتے۔اچانک ایک صبح ہم نے دیکھا کہ ہمارے گاؤں، کھیتوں، جھونپڑیوں اور سرگرمیوں کو ایک زبردست غیظ وغضب ڈھاتی ندی نے اپنی گرفت میں لے لیا۔" وہ کھو سے گئے۔

"تو کیا ہوا؟""میں یہ سمجھوں کہ عمر حادثاتی مناظر کو بھی پراسرار ڈھنگ سے پیش کرنے کا فن سکھا دیتی ہے۔"میں نے انتہائی تمسخرانہ انداز میں جواب دیا۔

"لیکن میں سوچتا ہوں کہ گاؤں حادثہ ہے یا ندی۔یا دونوں کا ملاپ، مجھے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ندی نے اپنے بچھڑے ہوئے ساتھی گاؤں کو آخرکار دریافت کر لیا ہے۔"

"تم کو تو بس بے تکی باتیں کہنے کی فکر لگی رہتی ہے۔تم چراغ پا ہو گئیں۔

"تو کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں لوگوں سے یہ کہتا پھروں کہ لوگو اس شخص کی سفید ریشی پر مت جاؤ اسے تو اس نے بس بہ طور بزرگی رکھ چھوڑا ہے۔"

"مگر........ مگر آپ دونوں کا ساتھ ساتھ گھومنا پھرنا، خواہ مخواہ لوگوں میں چہ میگوئیاں پیدا کر رہا ہے۔بابا تو خیر معصوم ہیں۔"

"لوگ"۔میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔بالآخر وہ تمھارے بوسیدہ دروازے کو ٹھوکر

مارتے ہوئے اندر آ چکا تھا اور تمھاری مسکراتی آنکھوں کو روندتا ہوا مجھ پر مسلط ہو گیا۔ تم ہی نے سقوطِ شب کی اولین ساعتوں میں مجھے ہر قید سے آزاد کیا تھا۔ اب میں تم سے بہت دور نمناک سرد سحر کے لمحوں میں سرخ اونچی سیدھی اور نوکیلی پہاڑی پر گامزن ہوں۔ میرے عقب میں لمحہ بہ لمحہ حملہ آور ہوتے ہوئے سنگین حصار کے ہاتھوں میں فرمان ہے اور نیچے طویل میدان، میدان سے پرے کولتار کی سڑک سے بائیں جانب تمھارا ٹوٹا مکان اور دائیں جانب دور درگاہ کا لمبا سایہ اور وہاں سے تھوڑی دور اونچائی پر سرخ پہاڑی کو گھورتا ہوا توپ کا دہانہ۔ ●●

چُپّی

منظر: تاریکی

(پردہ اُٹھتا ہے)

اسٹیج تاریک ہے.......... 30 سیکنڈ بعد روشنی اسٹیج پر پھیل جاتی ہے۔ منظر واضح ہوتا ہے۔

میدان

میدان کے وسطی خط پر، دائیں طرف ایک درخت ہے: بوڑھا، ہرا بھرا۔ پیڑ سے تقریباً ڈیڑھ دوگز کے فاصلہ پر ایک جوہڑ ہے: گندہ، گدلا گدلا، درخت قریب قریب ستر کا زاویہ بنائے زمین کی جانب اس قدر خم رسیدہ ہے کہ اس کے تنے کا بیش تر حصہ اور ابتدائی

شاخیں،قبر کے اوپر،اور شاخوں کا بیش تر حصہ اور ڈالیاں جو جڑ کی جانب جھکی ہوئی ہیں۔

میدان کے کنارے بائیں سمت ایک الکٹرک پول ایستادہ ہے۔چمک دار پول کی سطح کو سفید چمک دار پینٹ سے روشن کیا گیا ہے۔پول کے اوپری حصہ میں غالبًا ساٹھ کینڈل پاور بلب روشن ہے اور اوپر ہی کے آخری سرے پر چار الکٹرک تار اوجھل بائیں سمت سے آکر ختم ہوگئے ہیں۔ نیچے کے حصہ میں پول سے ہٹ کر ایک شخص اپنی پیٹھ اسٹیج کی سمت کیے کھڑا ہے۔اس کی پیشانی چمک دار پول کی سطح سے ٹکی ہے۔

میدان کی مٹی کالی

پس منظر میں آسمان! کھلا،شانت۔

وہ شخص پلٹتا ہے۔ یہ ایک نوجوان ہے،عمر پچیس کے اوپر جا چکی ہے۔سانولا رنگ، ستواں ناک،ویراں آنکھیں اور جسم دبلا پتلا،اس کے سر پر ہرے رنگ کی گاندھی ٹوپی اور بدن پر سفید رنگ کا کوئی جدید کوٹ اور گیروے رنگ کی دھوتی ہے۔پیروں میں جوتا چپل ندارد۔

نوجوان تھکے تھکے انداز میں ،پول سے ہٹ کر درخت کی سمت آگے کو آتا ہے، قریب رک کر اپنی دونوں ہتھیلیاں گھٹنوں پر ٹکائے سر جھکائے،آنکھیں اوپر کیے،درخت کو تاکتا ہے........اس کی آنکھوں سے فکرمندی جھلک اُٹھتی ہے.......اپنے دائیں انگوٹھے کو کنپٹی پر دبائے وہ ایک قدم آگے کو بڑھتا ہے اور کوٹ کی نچلی بائیں جیب سے ایک چاقو نکالتا ہے۔چاقو کے دستے کو اپنی مٹھی مین بھینچے، جھکا ہوا، کچھ دیر کسی انجانے عمل کو توقف دیتا ہے۔ اس کی پیشانی پر Y وائی نمارگیں تنی ہوئی ہیں،تھوڑا سا کھڑا ہوکر وہ درخت کی بوڑھی کھال چھلنا شروع کردیتا ہے۔اس عمل میں وہ انتہائی منہمک ہے۔درخت کی چھال اس کے پیروں کے قریب گرتی جارہی ہے........اچانک ہی اچھل کر وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلائے اس

حصہ کی طرف دیکھتا ہے جہاں سے اس نے چھال ادھیڑی ہے۔اس کی آنکھوں سے پہلے
مایوسی اور پھر خوف اُبھرتا ہے۔ادھیڑے ہوئے درخت کے حصہ میں...... دیمک کے اثرات
نظر آتے ہیں......... وہ پیچھے ہٹتا ہے اور شکستہ میز سے ٹکرا کر گرتا ہے۔کانپتے کانپتے اُٹھ کر قبر
کے بائیں کنارے اکڑوں بیٹھ جاتا ہے اور اپنے ہاتھوں کو بائیں سمت آگے جھکائے شاخوں کو
اوپر ہی اوپر اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے یہاں تک کہ شاخیں اپنا اصل تناؤ کھونے کو ہیں۔تب ہی
جانے کس خیال سے وہ اچانک شاخوں کو ہاتھوں سے چھوڑ دیتا ہے شاخوں کی زد سے اپنے
آپ کو بچانے کے لیے وہ ایک نحیف چھلانگ بائیں سمت لگاتا ہے مگر پھسل کر جوہڑ میں گر جاتا
ہے۔فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔اس کے لباس پر دھبے آ گئے ہیں اور چہرے پر بے معنی مسکراہٹ
......اب وہ پول کی سمت ہارے ہوئے انداز میں بڑھ رہا ہے۔پول کے قریب نیچے جھک کر
وہ اپنے ہاتھ زمین سے رگڑتا ہے اور تھوڑی سی مٹی لے کر دونوں ہتھیلیوں پر ملتا ہے۔پھر وہ پول
پر چڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔دوبارہ پھسلتا ہے مگر اس کے پیر زمین سے اوپر ہی رک جاتے
ہیں....... آخر کار وہ بلب کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور بلب کی جانب اپنا
دایاں ہاتھ بڑھائے اسے علاحدہ کرنے کے لیے کسمساتا ہے مگر فوراً ہی اپنا ہاتھ اُٹھا لیتا ہے۔
کوٹ کی نچلی جیب سے ایک مٹیالے رنگ کا رومال نکالتا ہے اور بائیں ہاتھ سے پول تھامے
دائیں ہاتھ میں رومال لیے بلب نکال لیتا ہے۔پول سے پھسلتا ہے اور آہستگی کے ساتھ پاؤں
زمین پر ٹک جاتے ہیں۔رومال پول کے قریب زمین پر پڑا ہے........ وہ دم لے رہا ہے۔
اس کے چہرے پر نامعلوم جوش دکھائی پڑتا ہے۔اب وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا قبر کی طرف جاتا
ہے.......... شکستہ قبر کی واضح دراڑ میں بلب کو ڈال دیتا ہے اور اطمینان سے جوہڑ کے قریب
آئے، اپنا چہرہ اور دونوں ہاتھ دھو لیتا ہے........ گیلا چہرہ گیلے ہاتھ سے وہ درخت کی طرف

آتا ہے۔ جھک کر درخت کے تنے سے اپنا سر ٹکائے، زمین پر پیر پھیلائے، آنکھیں میچے بیٹھ جاتا ہے۔ اس کا چہرہ ساکت ہے۔ ●●

تصحیح

........پردہ اُٹھ چکا ہے۔

اسٹیج کے عین قلب میں نیالے رنگ کی کرسی، دھات ادھات، محض گمان، بائیں سمت وسط دروازہ جس پر V.I.P کی تختی ٹنگی ہے۔دائیں سمت، وسط دروازہ جس پر Lavatory کی تختی آویزاں۔پس منظر میں سفید پردہ۔

ہال میں چند لمحے سکوت اور پھر سیٹیاں، آوازیں، چہ میگوئیاں اور شور کے بیچ، ہمارا مرکزی کردار کاندھے پر پھاوڑا اڈالے V.I.P دروازے سے نکلتا ہے۔ہال کی جانب رخ کیے حسرت سے آنکھیں پھاڑتا اور منہ کھولتا ہے:

''وہ ایک گونگی اندھی بہری رات اور بستر پر آسمان گر چکا تھا....... گیلے پاؤں لیے حاجت گاہ سے نکلا تو سامنے رائفل بردار ہاتھوں میں مشعلیں روشن، تب بھی سالم چاند

اخبارات کے پہلے صفحہ سے طلوع ہوا، کیا کیا جائے۔ غازی پور کی غلیظ عورتیں عبادت گاہوں کی طرف رواں دواں۔ پتہ نہیں چل سکا اسمال کھادی کا بیوپار بلیک کی سطح تک کیوں کر آیا۔ لوگ جوق در جوق چوک میں ایستادہ گنیش مورتی سے آنکھیں سینکنے میں منہمک اور عشاء کی نماز کے ختم تک اوپن نمبر آ چکا تھا۔ پلنگ پر آخری کیل کی طرح دو ایک ہونے میں مشغول، وہ گھبرا کر شکستہ رومانی مصرعے گنگناتا حاجت گاہ میں داخل ہوا۔ باہر علی گڑھ کی آواز پر رات گہری کر دی گئی ۔اب تو اخبارات کے صفحے حذف کر دو۔''

فی الحال...... مرکزی کردار اچانک چپ سادھے کرسی کے قریب پہنچتا ہے اور پھر میکانکی انداز میں اپنے دائیں ہاتھ میں کرسی سنبھالے پس منظر پردہ کے قریب پہنچ، کرسی کو پردہ سے ٹکائے اسٹیج کے دائیں سمت کے انتہائی کنارے پر سانسیں درست کرتا ٹھہر جاتا ہے۔ پھر انتہائی برق رفتاری سے اپنی پشت ہال کی جانب کیے، تھوڑا سا خمیدہ ہو کر زمین کھودنا شروع کر دیتا ہے۔ مرکزی کردار پسینہ میں شرابور اپنا چہرہ ہال کی جانب کیے شہادت کی انگلی سے پیشانی سے پسینہ گراتا ہے۔ اور گڑھے کے قریب آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا ہے۔ اپنی قمیص کی جیب سے بیڑی چقماق نکالے...... چند لمحوں بعد بے فکرے کش لیتا ہے، دو تین کش کے بعد پھر اپنی جیب سے کچھ بیج مثلاً جوار، گیہوں، چاول وغیرہ نکالے گڑھے میں ڈال دیتا ہے اور پھر بائیں ہتھیلی سے تیزی کے ساتھ گڑھا پاٹ دیتا ہے۔ کھڑے ہو کر پھاوڑا اُٹھائے لمبے لمبے ڈگ بھرتا .V.I.P دروازہ کے اندر غائب ہو جاتا ہے۔

''کیا ہونق پن ہے۔'' ہال سے مکالمے تخلیق ہوتے رہتے ہیں۔

.... ______________

.... ______________

اچانک .V.I.P دروازے سے ہمارا مرکزی کردار نکلتا ہے اور تیزی کے ساتھ کرسی

کے قریب جاتا ہے اس اثنا میں پس منظر پردہ کا رنگ سیاہ ہے۔ اپنی بشرٹ کی جیب سے وہ پلاسٹک کا تھیلی نما خول نکالتا ہے اور اسے کرسی کے ہتھوں پر چڑھا دیتا ہے اور نہایت اعتماد کے ساتھ چلتا ہوا پائی ہوئی زمین کے قریب آتا ہے، بیٹھتا ہے .... چند ہی لمحوں بعد پھر سے گڑھا نمودار ہوتا ہے۔ اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے وہ اپنی پتلون کی دونون جیبوں سے ایک ٹارچ، دو سیل، سگریٹ، ماچس نکالتا ہے کش لے کر فکرمند انداز میں دونوں سیل ٹارچ میں ڈال کر اسے روشن کرتا ہے۔ روشن ٹارچ کو گڑھے کے اندر چھوڑے، زمین پاٹے تیزی کے ساتھ V.I.P. دروازے میں غائب ہو جاتا ہے۔

"اٹ از این ابسرڈٹی" ______________

.... ______________

.... ______________

پھر ایک بار V.I.P. دروازے سے ہمارا مرکزی کردار نکلتا ہے اور زرد پس منظری پردے کے قریب رک کر اپنے بائیں ہاتھ میں کرسی لٹکائے کرسی کو اسٹیج کے عین وسط میں رکھتا ہے۔ اپنے نہرو شرٹ کی دونوں جیبوں سے دو لمبنڈ ٹائپ بوتلیں اور ایک پلاسٹک گلاس نکالتا ہے۔ بوتل میں ہرے اور لال رنگ کا مائع بھرتا ہے۔ ان دونوں مائعوں کا مرکب گلاس میں تیار کرتا ہے اور ایک بے حیا ہنسی ہنستا ہے۔ کرسی کے نچلے خلائی حصہ میں دونون بوتلیں رکھے، لبالب گلاس سنبھالے وہ پاٹے ہوئے گڑھے کے قریب پہنچتا ہے، وہاں پر گلاس خالی کرتا ہے اور خالی گلاس اپنی بائیں جیب میں ڈالے تقریباً بے صبرانہ انداز میں کرسی پر جھپٹے اس پر بیٹھ جاتا ہے اور آنکھیں موند لیتا ہے۔

"......... کچھ نہ ہو مگر اداکاری" "..........واہ.........."

اچانک Lavatory سے ایک نوجوان اپنی ناک دبائے نکلتا ہے، بغیر ادھر اُدھر نظر

کیے وہ سیدھا پائی ہوئی زمین کے قریب اکڑوں بیٹھ جاتا ہے اور چانک ہی اسٹیج پر جوتے، چپل اور سینڈل کی بارش ہونے لگتی ہے۔

پردہ گر چکا ہے۔ ●●

دمِ اُفعی

آج رام پور کے تمام ذی حیثیت لوگ پنچایت گرام میں بیٹھے کسی گمبھیر مسئلہ کو حل کر رہے تھے۔ پاس ہی نیم کا پیڑ اپنے ننگے بدن کو دیکھ سر جھکا کر خاموش کھڑا تھا۔ پنچایت گرام میں بھی لوگ سر جھکائے خاموش تھے۔ آخر سکوت کا یہ پردہ گاؤں کے سرپنچ فخرو چاچا نے اُٹھایا۔ فخرو چاچا گاؤں کی آخری نشانی تھے۔ ان کی آنکھوں نے تین حکومتوں کو اجڑتے اور بستے دیکھا تھا اور اس پر چاچا کو بڑا فخر تھا اور ہر بات میں اپنے تجربات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا' ان کی عادت سی بن گئی تھی۔ چاچا نے اپنی تجربہ کار نگاہیں لوگوں پر ڈالتے ہوئے کہا:

''آج اس بات کا فیصلہ ہونا ہی چاہئے'' تمام لوگوں نے بہ یک وقت ''ہاں'' کہا۔

چاچا نے لوگوں کے اشتیاق کو دیکھا اور گویا ہوئے۔ ''معلوم نہیں وہ اجنبی کون

ہے۔گاؤں آ کر ایک ہفتہ ہو گیا مگر آج تک کسی نے اس کی شکل......... صرف بھیمو نے شاید اسے دیکھا ہے۔'' انھوں نے بھیمو کی طرف ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔''شکل کسی نے نہیں دیکھی اس بات سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔دراصل زمانہ ہی خراب آ گیا ہے ورنہ ہمارے زمانے میں کوئی نیا مہمان آتا تو وہ آٹھ روز لوگوں سے ملنے میں گزار دیتا۔جب لارڈ مونٹ بیٹن ہمارے گاؤں کے قریب سے گذر رہا تھا تو میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔یہ میری اپنی بات تھی ،مگر یہاں پر میں گاؤں کا سرپنچ ہوں اس لیے گاؤں کی ہر بات کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ہر روز رات اس اجنبی کے مکان سے رونے کی بڑی بھیانک آواز آتی ہے۔جب میں نے پہلی دفعہ رونے کی آواز سنی تو مجھے محسوس ہوا آج بھی کوئی گورا ہمارے آدمی کو بازار میں گھسیٹ رہا ہو۔'' چاچا تھوڑی دیر تک اپنے حواس درست کرتا رہا۔لوگ دم روکے سنتے رہے۔پھر تھوڑی دیر بعد اس نے سانسیں درست کرتے ہوئے کہا۔'' مجھے تو شمو کا قصہ یاد آ گیا......... شاید اتوار کا دن...... ہاں اتوار ہی تو تھا۔اس روز گورے نے شمو کی بیٹی مالن کو دن دھاڑے اغوا کر لیا اور شمو اسی طرح رات بھر روتا رہا........ اس بھیانک اور دردناک آواز سے گاؤں والوں کی نیندیں حرام ہوگئیں ۔بچے ڈر کے مارے اپنی ماؤں کے سینوں میں سر چھپا لیتے ہیں اور اس پر طرّہ یہ کہ اس بھلے مانس نے اس کا نام پتہ پوچھے بغیر ہی مکان دے دیا۔'' چاچا نے فتو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔لوگوں کی نظریں فتو پر مرکوز ہوگئیں۔چاچا نے ایک عجیب سی خوشی محسوس کی اور سوچا لوگ آج بھی اس کی باتوں میں دل چسپی لیتے ہیں....... چاچا نے اپنا گلا کھنکارا اور کہا''پرسوں بھیمو مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ایک آدمی نے اسے دیکھتے ہی بھاگنا شروع کیا جو کوئی اسے راستہ میں ملتا وہ اسے دیکھ کر اس طرح بھاگتا گویا کوئی گورا پیچھے لگا ہوا ہو۔'' چاچا کو انگریزوں سے ازلی بغض تھا۔فتو کی حالت غیر

ہورہی تھی۔اس نے چندروپوں کے لالچ میں آ کر مکان کرایہ پر دے دیا تھا اور کرتا بھی کیا........ آٹھ زندگیاں اور بھوک کا بے رحم دیوتا.......... اسے کیا معلوم تھا کہ کرایہ دار اتنا پراسرار ہوگا جس کی جواب دہی کے لیے اسے پہلی دفعہ پنچایت گرام آنا پڑے گا۔اس نے دیکھا سب اس کی جانب غصہ بھری کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں وہ گھبرا کر اُٹھ گیا اور کہنے لگا.......

''کچھ دن ہوئے مجھے ایک خط ملا تھا..... خط میں لکھا تھا۔''میں آ رہا ہوں۔زیادہ دن نہیں رہوں گا۔ایک دن کا کرایہ دوروپیہ دوں گا....... نیچے کچھ عجیب قسم کے دستخط تھے۔''اس نے اچانک اپنے جیب سے خط نکالا اور چاچا کو دے دیا۔لوگ اس خط کی جانب اس طرح دیکھنے لگے گویا پہلی دفعہ کسی خط کو دیکھا ہو۔دستخط متوجہ کیے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔کچھ مبہم الفاظ تھے صرف ایک حرف''ش''واضح نظر آ رہا تھا۔فتو نے دیکھا لوگوں کا غصہ کچھ تھم رہا ہے تو اس نے کہا:

''آپ لوگ جانتے ہیں کہ وہ گھر بھوتوں کی وجہ سے بدنام ہو گیا ہے۔کوئی بھی اسے خریدنے اور کرایہ پر لینے تیار نہ تھا۔میں نے بھی تنگ آ کر وہاں رہنا چھوڑ دیا،اس صورت میں کوئی آدمی ایک دن کا دو روپیہ کرایہ دے تو میری خوشی کا کیا ٹھکانہ؟ خوشی کی وجہ سے میں نے چابی دیتے وقت اس کا نام پتہ کچھ بھی نہیں پوچھا۔چابی دیتے وقت چند لمحوں کے لیے میں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔''وہ تھوڑی دیر چپ رہا اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا آگے کی بات کہنے میں اسے موزوں الفاظ نہ مل رہے ہوں۔پھر اس نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا:

''کچھ عجیب سا چہرہ تھا میں نے تو اسے بارہا دیکھنا چاہا مگر میری نظریں خود بہ خود جھک جاتی تھیں۔آنکھوں میں وحشت اور یاس کی لکیریں اور چہرہ آگ کی طرح سرخ۔''

اچانک بھیمو اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

''میں نے بھی اس بھاگتے ہوئے آدمی کی ایک جھلک دیکھی تھی۔اس کا چہرہ بھی آگ کی طرح سرخ تھا۔''

لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔دھرم داس جو ہمیشہ اپنے ساتھ اخبار رکھا کرتا تھا کہنے لگا۔''وہ ضرور پاکستانی پیراشوٹ ہوگا۔ہمیں اسے حکومت کے حوالے کر دینا چاہئے۔اس سے ہمارے گاؤں کا نام بھی ہوگا اور انعام بھی ملے گا۔'' یہ کہہ کر وہ لوگوں کی جانب اس طرح دیکھنے لگا گویا ابھی ابھی حکومت نے اسے انعام سے نوازا ہو۔حمید نے نعیم کے کان میں کہا''دیکھنا وہ مہا سبھائی ہوگا جو گاؤں میں فساد برپا کر کے چلا جائے گا۔''نعیم نے اس طرح گردن ہلائی گویا سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا ہو۔چندر کانت جواب صرف نام کے جاگیردار رہ گئے تھے اور بہت دیر سے خاموش تھے کہنے لگے''کہیں وہ چین نواز کمیونسٹ نہ ہو۔میرا خیال ہے وہ سوفی صدی کمیونسٹ ہے ورنہ چہرے پر لال رنگ کیوں لگواتا؟'' یہ کہہ کر وہ فتح مندانہ نگاہوں سے لوگوں کی جانب دیکھنے لگا اور ادھر ہیرا چند جو کمیونسٹ تھا اور دو دفعہ الیکشن ہار چکا تھا تلملا اُٹھا اور اٹھ کر انقلابی انداز میں کہنے لگا۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ اس ملک میں تباہی کی ایک آندھی آنے والی ہے۔جب تک عوام امریکی گیہوں کھاتے رہیں گے وہ ترقی نہیں کر سکتے........ انقلاب نہیں آ سکتا''دھرم داس نے چندر کانت کے کان میں کہا۔

''سالا کل ہی تو گیہوں کے لیے دو گھنٹے تک کیو میں کھڑا تھا۔''اچانک چاچا کو کچھ یاد آیا اور انھوں نے جیب سے کچھ کاغذات نکالے۔لوگ ناک بھوں چڑھانے لگے۔چاچا نے ایک کاغذ دکھاتے ہوئے کہا''یہ کیا ہے؟''

لوگوں نے اکتاہٹ سے جواب دیا،مغل بادشاہوں کی محصول ادائیگی کی رسید ہے۔''

''اور یہ کیا ہے؟''

''یہ انگریزوں کی محصول ادائیگی کی رسید ہے۔

''اور یہ؟''

''ہماری حکومت کی رسید۔''لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔چاچا کچھ دیر مسکراتے رہےاورسوچاباپ کی ادا کی ہوئی نقل رسید آج کا کام میں آگئی۔

''میں نے تین حکومتوں کواجڑتے اور بستے ہوئے دیکھا ہے۔میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ضرور وہ کوئی گورا ہے جوایک بار پھر آہستہ آہستہ ہماری حکومت کوختم کرنے آیا ہے۔''دھرم داس ہنس پڑا۔رام سنگھ نے اپنے پوپلے منہ سے بڑبڑایا''سالا لیگی''.........اجنبی کے بارے میں چہ میگوئیاں بڑھتی جارہی تھیں،آخرکار طے پایا کہ رات جب وہ حسبِ معمول روتا ہے جا کراس سے دریافت کیا جائے کہ وہ کون ہے کہاں سے آیا ہے اور کیا کرتا ہے۔تھوڑی دیر بعد پنچایت گرام خالی پڑا تھا۔سورج ڈوب چکا تھااور اندھیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔

رات جب اپنا سایہ لمبا کر چکی تھی اچانک پھروہی رونے کی آواز اُبھری۔لوگ اجنبی کے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔اچانک رونے کی آواز بند ہوگئی۔مجمع ٹھٹک پڑا۔چاچا نے زنجیر کھٹکھٹانا ہی چاہی تھی کہ آواز آئی۔سب لوگ کھڑکی میں منہ ڈالے دیکھنے لگے۔وہ اجنبی اپنا منہ چھت کی طرف کیے کہہ رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں تیرے ننانوے نام ہیں مگر آج تو ایک اور نام کا اضافہ

کرلے، ''دھوکہ باز'' .... اگر مجھے معلوم ہوتا کہ انسان اتنا شاطر ہوگا تو میں اسی وقت آدم کو سجدہ کرلیا ہوتا آج میں اقرار کرتا ہوں کہ مٹی آگ سے عظیم ہے۔ میں تجھ سے بھیک مانگتا ہوں کہ مجھے عبادت کے قابل بنا کیوں کہ لاکھوں برس ہوئے میں اسے بھول چکا ہوں یا مجھ میں بدی کی طاقتیں انسان سے زیادہ عطافرما۔ اب میں ایک بے کار شئے ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔

لوگ کمرے کے اندر کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ چاچا نے منع کیا اور اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور کہا ''نہ جانے کون ہے۔ بے چارہ خدا سے کہہ رہا ہے کہ میں نے گناہ کیا اب مجھے معاف کر.......... معلوم ہوتا ہے زمانہ کا ستایا ہوا ہے۔ ہمارا کیا لے گا، دو تین روز رہ کر واپس چلا جائے گا.......... بے چارہ......... ''لوگ سرپنچ کی بات سے مطمئن واپس لوٹنے لگے، رات اور کچھ گہری ہوگئی تھی اور فضا میں ہچکیوں کی آواز عجیب اسرار پیدا کررہی تھی۔



آتشِ عنقا

آج تمام فرشتے جہنم کی آگ سے اپنے ہاتھوں میں دبی ہوئی سردی کو تیار بے تھے۔ان سب سے بے نیاز شیطان کائنات پر ایک لامحدود کھمبے کی طرح ایستادہ لوگوں کو اپنی جانب بلا رہا تھا۔آگ کی ہستی........بشیر،راستے ہی میں ٹھرّے کی بوتل اپنے حلق میں اُنڈیلتا جلدی جلدی آگے کی طرف بڑھنے لگا۔پھر بھی اس رات کی سردی اس پر بے تحاشا ہنس رہی تھی۔وہ راستے کی بدبودار گلیوں،نالیوں سے بے پروا آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا۔کاش کوئی گاہک اسے سلگا لے۔اس کے سلگنے سے ایک چولہا سلگ سکتا ہے اور اس چولھے سے گھر کے بچوں،بیوی کے بجھے ہوئے پیٹ کی آگ بجھ سکتی ہے،اور تو اور نندو نے سلگنے کے لیے سگریٹ کی پیکٹوں سے زیادہ فلم ایکٹریسوں کی تصویریں جگہ جگہ چپکا دی تھیں۔مگر اس سے ایک چوک ہوگئی تھی کہ وہ سب کی سب لباس پہنے ہوئے تھیں۔آخر ہے نا ایک پان والا۔بشیر نے اپنی

جیب ٹٹولی۔ دس کا ایک نوٹ جو کبھی کبھی تنخواہ سے پہلے آ جاتا ہے اور جس کے لیے اس سردی میں جی کو مار کر وہ کام کرنا پڑتا ہے جو دفتری امور کے حساب سے آٹھ روز کے کام کے برابر ہوتا ہے....... اور نہ بھی کرتا تو کیا کرتا۔ سات زندگیوں کی محض بھوک مٹانا، یہ کام بھی اس کی تنخواہ نہیں کر سکتی تھی۔ یوں آٹھ افراد تھے مگر وہ اپنے آپ کو ان میں شامل نہیں کر سکتا تھا، کہ بہت سال ہوئے اس کی بھوک ختم ہو چکی تھی۔ مسلسل فاقوں سے اس کی آنتوں نے یہ سبق لیا تھا کہ کھانا اب صرف قے کرنے کے قابل ہے۔ اس لیے وہ صرف شراب پیتا تھا صرف شراب......... کچھ دیر کے لیے تو اس سے اپنے آپ کو بھول سکتا تھا اور انھیں بھی جنھیں وہ ابھی سے فاقوں کی ٹریننگ دے رہا تھا۔ اس نے دو قدم اور آگے بڑھائے اور نندو کی دوکان سے گول کنڈہ کی پیکٹ خریدی۔ ریزگاری نہیں تھی نندو نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا اور پیسے کل لینے کے لیے کہا۔ بشیر دس کا نوٹ اور نندو کی حسرت کو اپنی جیب میں ڈالے بڑھنے لگا۔

سگریٹ کا دھواں پیچھے پیچھے چکر کھا رہا تھا اور اس کے خیالات آگے کی جانب نکلنے لگے وہ سوچ رہا تھا اس کی بیوی اس کے قدموں کی چاپ کی منتظر ہو گی اور بچے بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ کیا واقعی بچے اس کا انتظار نہیں کرتے؟ محض اپنی بھوک کی تسکین کا انتظار کرتے ہیں......... امیر، ملکہ تاج...... بے ارادہ اُس کے ہونٹوں پر ہنسی نمودار ہو گئی۔ اس نے بھی اپنے بچوں کے نام غیر شعوری طور پر کیسے کیسے رکھ دیے۔ کیا اس کے لاشعور میں ایک اچھی زندگی کا تصور انگڑائی نہیں لے رہا ہے؟ تبھی تو وہ ان ناموں، ان لفظوں کے سحر سے جن سے یہ نام بنے تھے، بچ نہ سکا تھا۔ اسے کتابی الفاظ یاد آ گئے کہ سدھارتھ نے کہا تھا ''الفاظ کے سحر سے بچو۔'' کیا کوئی لفظوں کے سحر سے بچ سکتا ہے۔ ہرگز نہیں خود سدھارتھ لفظوں کے سحر سے نہ بچ سکا۔ ورنہ کیا بات تھی کہ ''وہ میرا بیٹا مر گیا'' کے سحر سے بچ نہ سکا اور

نروان کی تلاش میں انسانی دکھ کے مداوا کے لیے نکل پڑا۔ ورنہ لاکھوں لوگ روز یہ جملہ سنتے ہیں اور کافی ہاؤس کی طرف چل دیتے ہیں۔ سدھارتھ کی طرح نروان کی تلاش میں نکل نہیں پڑتے۔ دراصل لفظ بڑا ساحر ہے جو شخصیت دیکھ کر عمل کرتا ہے۔ لفظ محبت میں 'وہ سحر ہے' معلوم ہوتا ہے کوئی مدھم مدھم سروں میں مسلسل گھنٹیاں بجا رہا ہو۔ لفظ نفرت میں چنگھاڑنے والی موسیقی نکلتی ہے لفظ بھوک سے کسی خوں خوار بھیڑیے کا تصور ذہن کے پردے پر چھا جاتا ہے۔ الفاظ میں بڑی طاقت ہے۔ اس دنیا میں آدمی کبھی نہ کبھی الفاظ کے نروان کو پالیتا ہے۔ اگرچہ اب محبت میں مدھم سروں کی گھنٹیوں کے بجائے لاتعداد چیخیں نکلتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔ زمانے نے ہر چیز کا چہرہ مسخ کر دیا ہے، اسی طرح جس طرح امیر، تاج، ملکہ .... اپنے باپ کے بجائے اپنی تسکین کے انتظار میں ہیں .... بشیر کے ہونٹوں سے ہنسی معدوم ہوتی گئی اور اس نے غصے سے سگریٹ ایک طرف پھینک دیا۔ سامنے نذر اللہ اپنی تجوری سے ٹیک لگائے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ یوں لگتا تھا گویا وہ اس سرد رات میں تجوری کو آتش دان سمجھ رہا ہو۔ بشیر اس سے نظریں بچاتا تیزی سے نکل گیا کیوں کہ گذشتہ مہینے کا حساب باقی تھا۔ گھر قریب آ رہا تھا۔ اس نے سامنے کی دوکان سے دو درجن کیلے خریدے اور پیسے جیب میں ڈالے گھر کی طرف چل دیا۔

دروازے پر قدم رکھتے ہی اسے محسوس ہوا وہ گر پڑے گا وہ اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا گھر کے اندر داخل ہوا۔ بچے فوراً کیلوں پر جھپٹ پڑے اور وہ دھم سے بستر پر گر پڑا۔ بیوی سے رضائی منگوائی اور اسے اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا۔ مگر سردی تھی کہ کم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی بیوی نے کنکھیوں سے کیلوں کی طرف دیکھا۔ سارے کیلے ختم ہو چکے تھے۔ وہ آہستہ سے اُٹھی اور بچوں کو بستر پر سلا دیا اور بے بسی سے چھلکے اُٹھا کر باہر پھینک دیے۔ ایسا لگ

رہا تھا وہ جھلکے نہیں اپنی بھوک پھینک رہی ہو، پھر وہ آہستہ سے چلتی ہوئی بشیر کے بستر تک آئی۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا اور وہ بھی لاچار سونے کی کوشش کرنے لگی۔

سورج نے آہستہ آہستہ اپنی پلکیں کھولیں مگر بشیر کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں......... اس کی بیوی نے باپ کو تکتے ہوئے بچوں کے چہروں کو دیکھا وہ یہ نہیں کہہ سکی اب وہ بشیر کا، اپنے باپ کا انتظار نہ کریں۔ دوپہر تک کسی طرح روپیوں کا انتظام ہو گیا اور لوگ اس کو دفنا کر گھروں کو واپس آ گئے۔

بشیر نے آنکھیں کھولیں چاروں طرف گھپ سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ آج وہ واقعی مر گیا ہے۔ اسے اپنے گھر کا خیال آیا۔ نہ جانے سکینہ میرے بعد کس طرح گھر چلا......... چاروں طرف روشنی ہوگئی۔ دو نورانی صورت بزرگ قبر میں داخل ہوئے اور بشیر کی جانب بڑھنے لگے، ان میں سے ایک نے کچھ کہنے کے لیے منھ کھولا ہی تھا کہ بشیر نے ٹوکا ''مجھے عربی نہیں آتی۔''

دوسرے بزرگ نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا ''یہاں زبان کا جھگڑا نہیں ہے۔''

پھر پہلے بزرگ نے کہا ''تمھارا نام؟''

مردے کے چہرے پر سنجیدگی آئی اور اس نے جواب دیا ''کلرک''

بزرگ نے آنکھیں نکال کر کہا ''ہم تمھارا پیشہ نہیں بلکہ نام پوچھ رہے ہیں۔''

''ہمارا ایک ہی نام ہوتا ہے۔ ویسے مجھے بشیر کہتے ہیں۔'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''تم نے اپنی زندگی میں شراب پی ہے؟'' ایک نے پوچھا۔

''ہاں جب کبھی غم حد سے تجاوز کر جاتے تو یہ مجھے سہارا دیتی تھی۔''

بشیر نے جواب دیا۔

''بیس کوڑے لگاؤ۔'' پہلے بزرگ نے کہا۔سزا ختم ہونے پر اس نے سوال کیا ''تم نے رشوت لی؟''

''ہاں۔جب کبھی........''

''.......بیس کوڑے،'' فرشتے نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اس طرح مختلف سوالات ہوتے رہے اور وہ کوڑے کھاتا رہا۔آخر میں ایک بزرگ نے کہا۔

''کیا تمھیں آخرت پر یقین تھا؟''

بشیر کے ہونٹوں پر زہر خند دوڑ گیا۔

''قرآن پڑھا تھا؟''

بشیر نے جواب دیا ''ان اللہ مع الصابرین''

''بیس کوڑے''

سزا ختم ہونے پر دونوں بزرگ واپس جانے لگے۔بشیر نے آواز دی اور پوچھا ''کیا میں ایک سوال کر سکتا ہوں؟''

''ضرور'' دونوں نے جواب دیا۔

بشیر نے حسرت بھرے لہجہ میں پوچھا، ''قبر کا عذاب ختم ہو گیا؟''

''ہاں۔'' جواب ملا۔

اچانک بشیر کے منہ سے ایک قہقہہ نکل پڑا اور اس نے کہا۔ ''تو وہ مولوی جھوٹ کہتا تھا کہ قبر کا عذاب انسان کی برداشت کے باہر ہے۔اتنا عذاب تو میں نے زندگی میں چند لمحوں

کے سہا ہے۔''فرشتے آگے بڑھنے لگے۔بشیر نے پھر ٹوکا اور لجاجت سے کہا'' آخری سوال کیا واقعی انسان فرشتوں سے عظیم تر ہے؟''

''ہاں'' کہہ کر وہ دونوں چل دیے اور قبر میں گھپ سیاہی پھیل گئی۔ ●●

حیات

اسی مکان میں، جس کی ایک دیوار، بھرپور برسات کی پھوار میں خود کو منہدم کرنے کے انتظار میں کھڑی ہے، وہ اپنی تخلیقات کو سوچ نکالتا ہے۔

مکان کا ذرہ ذرہ، گھٹا گھٹا سا ماحول، شاداب مگر بوڑھا نیم کا درخت اور وہ شکستہ کرسی جو انتظار کرتی ہے کہ کب وہ اپنی تخلیق کو مکمل کیے اس کی آغوش میں سمائے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے، سب ہی چند ماہ سے اس کی جانب پر اُمید نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

کبھی کبھی اسے یہ خیال ہوتا کہ جب کبھی وہ اپنی تخلیق مکمل کیے دل ہی دل میں، لبوں کے اوپری حصہ میں مسکراہٹ دبائے ہوتا ہے، یہ کرسی بھی اس کے ساتھ مسکراتی ہے۔ شاید اس کی چرچراہٹ اس بات کی گواہی دیتی ہے...... یہ کھڑکی جس کی زنگ آلود سلاخوں پر وہ اپنا سر ٹکائے]دور دائیں جانب کی سڑک پر چلتے پھرتے کرداروں کا مشاہدہ کر رہا ہے اور یہیں سے

اس نے بہت سے کرداروں کو اپنی تخلیقات میں سمویا ہے، اس سے شکوہ کررہی ہے کہ آخر کب تک، وہ، یونہی اس کے جسم پر اپنا جسم ٹکائے کرداروں کا انتظار کرتا رہے گا۔

آج وہ کئی ماہ سے اپنی کسی تخلیق کے لیے سرگرداں ہے۔ روز وہ کرسی، کمرے کا ماحول بوڑھا پراسرار درخت اور یہ کھڑکی، عجب نظروں سے اسے تاکتے رہتے ہیں کہ شاید وہ قلم اُٹھائے مگر اس کو جانے کیا ہوگیا تھا کہ کوئی تخلیق الہامی یا اکتسابی ہی سہی، ذہن کے پردوں کو نہیں جھنجھوڑ رہی تھی۔ اسے اپنے آپ پر غصہ بھی آرہا تھا کہ وہ شاید جان بوجھ کر، اپنی تخلیق، جو اس کے ذہن کے کسی گوشے میں دبی کراہ رہی ہے، جگا رہی ہے، مگر فوراً ہی اس خیال کو تشنگی و تخلیقی رخ سمجھ کر جھٹک دیتا۔

وہ سوچتا! انسان بھی کتنا ستم ظریف ہے الزام رکھنے کی عادت، خواہ وہ اپنی ذات پر کیوں نہ ہو، کس بری طرح کا شکار ہے۔ اسے کسی پل چین نہیں رہتا، کسی نہ کسی کو مجرم ٹھہرا کر، وہ اپنے اندر طمانیت اور سکون، چند لمحوں کے لیے ہی سہی، پیدا کر لیتا ہے۔

وہ تو اور اُداس ہوگیا، لوگوں کی یہ بات ذہن میں آئی کہ ابدی فن کی تخلیق کے لیے کسی پریرنا کا ہونا ضروری ہے۔ یہ پریرنا ہی کا غم ہوتا ہے جو اسے تخلیق پر اکساتا ہے۔

وہ سوچتا: پریرنا کا غم ہی کیوں؟ پریرنا کی خوشی کیوں نہیں؟

لیکن اسے اس سے کیا؟ وہ تو اس نیم کے درخت کی طرح....... تنہا تھا۔ وہ ابھی کچھ ماہ پہلے اتنا تنہا نہ تھا.......... یوں نیم کے درخت پر خزاں نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا مگر مکان کے عقب سے اُبھرتے، بہار کے قہقہے اسے موسم سے بے نیاز کردیتے۔ پھر قہقہوں کے الوداع پر کیا رہ گیا تھا؟ غم.........

مگر اسے تو کسی پریرنا کا غم نہیں تھا؟ اس کا غم تو یہ تھا کہ اس کی تخلیق کہیں کھوگئی ہے اور

جسے کھوجنا اس کا مقدر ہے۔ نہ جانے، نہ معلوم غم کیسے ہوتے ہوں گے۔

آج بھی جب وہ سڑک پر لوگوں کی جانب غائر نظر ڈال رہا ہے تو اسے ایسے ہی افراد نظر آرہے ہیں جن کو اس نے اپنی کسی نہ کسی تخلیق میں جگہ دی تھی، وہ ہاتھ میں تھیلی پکڑے جاتا ہوا مزدور رئیس، تھکے تھکے قدموں سے آتا ہوا عثمان کلرک، لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پروفیسر زنجن، سب ہی اس کی تخلیقات کے کردار رہ چکے ہیں۔ اب ان کی مصروفیات میں اس کے لیے کوئی کشش نہیں رہ گئی تھی......... اور تو اور وہ فٹ پاتھ پر دونوں ہاتھوں سے بے نیاز کوڑھی بھی اس کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتا جسے اس نے آج سے پانچ سال قبل اسی طرح گھسیٹتا ہوا دیکھا تھا اور آج بھی وہ گھسیٹ گھسیٹ کر جی رہا ہے۔

وہ سوچتا ہے، انسان میں جینے کی تمنا کتنی فربہ ہے بھرپور زندگی کے ساتھ زندہ ہے۔ زندگی خواہ گھسیٹ گھسیٹ کر ہی گذرے مگر وہ موت کے آرام دہ بستر پر سونا نہیں چاہتا۔ جینے کی ہوس نے ہی شاید روح کی عظمت کا فلسفہ ایجاد کیا ہوگا......... وہ موت کے وقت بھی یہ یقین کر کے خوش رہتا ہے کہ کم از کم اس کی روح تو ہمیشہ کے لیے زندہ رہے گی۔ حالانکہ اس کے دل کی اندرونی تہوں میں یہ حسرت دبی ہے کہ روح سے ہمیشہ کے لیے رشتہ جوڑ لینا، جسم کی ساری لطافتوں کو خواہ وہ کتنے ہی آلام سے بھری کیوں نہ ہو، کھو دینا ہے۔ اس لیے آج بھی وہ جسم کو بچانا چاہتا ہے۔ زندگی کی آخری سانسوں تک۔ توبہ! اس نے سوچا، کیا روایتی، پٹے پٹائے خیالات نے اسے جکڑ رکھا ہے۔ مگر ایک کہن آلود زندگی سے اور توقع بھی کیا کی جاسکتی ہے؟''

وقت بیتا جا رہا ہے، اس کی الجھن اور کوفت بڑھتی جا رہی ہے۔ لوگوں کی گردن میں زندگی کا ہل ڈالے وقت بڑی بے دردی سے انھیں ایک ان جانی منزل کی جانب کھینچ رہا ہے اور وہ یہاں بے کار ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے، وہ بے کار ہی تو ہے۔ اونہہ، توبہ!

اچانک فضا میں ایک تبدیلی آ رہی ہے۔ لوگ سراسیمگی سے تیز تیز قدم اُٹھائے رواں دواں ہیں۔ شام کی شاہ زادی نے دوپہر کے شاہ زادے سے کچھ کہا ہے۔ شاہ زادے کے چہرے پر افسردگی کے تاثرات پیدا ہو گئے ہیں اور وہ شاہ زادی کے محل سے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ نہ جانے کہاں جا رہا ہے۔ پھر الوداع ہوتے ہوئے شاہ زادے کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کے چند قطرے ٹپکے اور آسمان سے بوندا باندی شروع ہوگئی۔ شاہ زادی نے یہ دیکھا تو اپنی باندیوں کو حکم دیا کہ سازوں پر طربیہ نغمہ چھیڑ دیں، باندیوں نے ہزاروں سازوں پر طربیہ نغمہ چھیڑ دیا ہے۔ جو اس کی ٹین کی چھت پر آ کر اور بھی طربناک ہو گیا ہے۔ یہ دیکھ کر گرتے ہوئے شاہ زادے نے ایک آہ بھری جو ان نغموں میں بے ترتیبی پیدا کر رہی ہے۔ شاہ زادی نے گھبرا کر اپنا سرخ محل بند کر دیا ہے اور چاروں طرف ایک دھند لکا چھا رہا ہے۔ سڑک کسی نااُمید سکتہ گر عاشق کے دل کی طرح خالی ہوگئی ہے۔

اس نے پیکٹ سے سگریٹ نکالا اور دیا سلائی جلائی۔ مگر وہ بے ترتیب ہواؤں کے آگے سنبھل نہ سکی، پھر اس نے دوبارہ بڑی احتیاط سے اپنی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان جلتی دیا سلائی سے سگریٹ جلایا اور لمبے کش لینے لگا۔ وہ سوچتا ہے: ''ہر چیز کو نہ جانے سہارے کی ضرورت کیوں ہے۔''

پھر اس کی نگاہ اپنے سامنے کی ملبہ نما عمارت پر رکی اس نے سوچا؛ کبھی یہ عمارت کتنی تمکنت سے کھڑی رہی ہوگی، مگر اب اس میں جا بہ جا دراڑیں، گری ہوئی دیواروں کے ڈھیر کے علاوہ کچھ بھی تو نہیں نظر آتا۔ اس کی نظریں اس ویران عمارت کا احاطہ کرتے ہوئے اوپر کی جانب اٹھ گئیں اور اسے پہلی بار چونکنا ہی پڑا۔ عمارت کے بالکل اوپری حصہ پر ایک شکستہ تختی گڑی تھی جس پر کسی نے بڑی خوب صورتی سے تراشا تھا۔ ''حیات........'' آدھی تختی ٹوٹ

چکی تھی اوراس کا دوسرا حصہ نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔اس کی جگہ پلاسٹر سے بے نیاز دیوار منہ چڑا رہی تھی۔شایداس گم شدہ تختی کے ٹکڑے پر اس عمارت کی پیدائش لکھی ہو جواب گم ہے،مگر یہ نام بھی کتنا عجیب تھا۔حیات،ہائے حیات !اس نے زور کا کش لیا اور پھراس کے منہ سے نکلا،اُف حیات،سگریٹ کی راکھ باہر پھینکتے ہوئے اس نے کہا۔'اونہہ حیات' اس کی ذہنی رو بہک گئی اوراس نے سوچا:

''نہ جانے حیات کے آگے کیا ہوگا؟ حیات کے آگے کیا ہوسکتا ہے،اس کے ذہن نے سوال کیا.......... شاید،حیات منزل ہوگا؟ حیات کی بھی کوئی منزل ہے؟''

کیا حیات بجائے خود ایک منزل نہیں!

تو پھر شاید ''حیات محل'' ہوگا،اس نے سوچا،نہ جانے حیات محل کیسا ہوگا؟ مگر اب تو یہ محل ڈھیر ہو چکا تھا۔کاش اس نے سوچا!اسے وہ تختی کا گم شدہ ٹکڑا مل سکتا اس حیات محل...... کو نہ جانے کس نے بنایا تھا؟ شاید کسی بے فکرے نواب نے بنایا ہوگا۔پھر وہ جلدی جلدی کش لینے لگا اوراس کی نگاہیں فوراً اپنے قلم پر اُٹھ گئیں مگر دوسرے ہی لمحہ وہ تذبذب میں پڑ گیا کیوں کہ یہ بڑا وسیع معاملہ تھا۔

''تم کہاں گم ہوگئی ہو بہار عقب'' اس نے سوچا،نیم کے پتے سرسرا اُٹھے۔کڑوی سرشت والا بوڑھا درخت !انسان کی مجبوریاں !مگر اس بے فکرے نواب کی جانے کیا مجبوری تھی جواس نے اس عمارت کا نام حیات......... رکھا!

شاید حیات اس کے بچے کا نام ہو۔بچہ اور حیات........ کچھ عجب سا لگتا ہے۔اور اسے یہ بھی عجب لگا،جب اس نے اس عمارت کے اکلوتے محفوظ کمرے کے بہت بڑے دروازے پر ایک چھوٹا سا مسطح قفل جھولتا دیکھا!!

اب فضا میں ایک ہلکا سا خوش گوار احساس پیدا ہو رہا تھا۔ وہ ایک سگریٹ سلگا چکا تھا۔ اور پھر اس کی نگاہیں حیات کے پھاٹک پر مرکوز ہو کر رہ گئیں....... سگریٹ کے مرغولوں کے اس پار دھندلے دھندلے ماحول میں اس نے پھاٹک پر یہاں کے ایک مشہور سماجیات کے پروفیسر کو کھڑا دیکھا، پروفیسر چھڑی کا سہارا لے کر اپنی عینک کے پیچھے گول گول آنکھوں سے حیات کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی خمیدہ کمر کو اٹھائے آہستہ آہستہ حیات کے اندر بڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے پھاٹک کے اندر قدم رکھا، آسمان نے اپنے سینے کے اندر دیر سے دبی ہوئی چیخ اگل دی۔ اسے ایسے لگا جیسے حیات تھرتھرا رہی ہو۔

پروفیسر آگے بڑھتا ہوا قفل کے پاس رک گیا، اور اس کے جھرّی دار چہرے پر شکنیں واضح ہو گئیں۔ وہ قفل کو غور سے دیکھتا رہا اور بعد میں اپنی چھڑی کو زور سے زمین پر دباتے ہوئے قفل کی طرف منہ کیے کہنے لگا۔

''یہ تو صحیح ہے کہ خون بہ ہر حال خون ہے اور تمام انسانوں کے خون کا رنگ ایک ہی ہے، مگر اس خون میں تیرنے والے خلیوں کے رنگ تو بہر حال جدا ہیں۔ اس لیے رنگ ہی اصل چیز ہے۔ رنگوں میں برتری ہے، رنگوں میں کم تری''، اسی کے ساتھ قفل ایک جھٹکے کے ساتھ خود بہ خود کھل گیا اور پروفیسر نے فاتحانہ انداز میں دروازہ کھولا اور کمرہ میں داخل ہوا۔

وہ پروفیسر کی ایک ایک حرکت کو کھڑکی سے دیکھ رہا تھا اور اس کی اُلجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ عجب ماجرا تھا۔ اس ملک کا مشہور پروفیسر جس کی کئی کتابیں سماجیات کے موضوع پر چھپ چکی تھیں، اس ویران حیات میں کیا کرنے آیا تھا؟ اور............ اچانک ہی پروفیسر کمرے سے نکلا اس کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔ اس نے دروازے کی زنجیر لگائی اور اپنی جیب سے ایک اور قفل جو پچھلے قفل سے بڑا تھا لگا دیا۔ یہ قفل اس قفل کی طرح مسطح نہیں

تھا بلکہ اس پر ایک چمکتی ہوئی کیل صاف نظر آ رہی تھی....... وہ فاتحانہ چال چلتا ہوا حیات سے باہر نکلا اس نے پھر ایک بار حیات کی طرف غور سے دیکھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کہیں چل دیا۔

اس کے دل میں اچانک ایک خواہش اُبھری کہ وہ پروفیسر سے اس ماجرے کو پوچھے مگر اس کو اس کی رہائش کا پتہ معلوم نہ تھا، پھر اُس نے سوچا: خود ہی جا کر اس کمرے کو دیکھ آئے۔ مگر وہاں تو پروفیسر کا قفل لٹک رہا تھا اور وہ قفل بھی کس طرح جھٹکے کے ساتھ خود بہ خود کھل گیا تھا۔؟ اس نے اپنی آنکھیں زور سے ملیں کہ شاید اس کے تخیل نے یہ سارا بکھیڑا کھڑا کر دیا ہو مگر وہاں سچ مچ پروفیسر کا لگایا ہوا قفل لٹک رہا تھا۔ سیاہی غالب ہو رہی تھی اور اس کمرہ کا راز، پروفیسر کی عجیب حرکت، اسے بے کل کر رہی تھی۔ وہ رات بڑی بے چینی سے گذری۔ رات خواب میں وہ قفل اسے لٹکا ہوا دکھائی دیتا رہا۔

صبح رات سے زیادہ پریشانی لائی۔ وہ اسی طرح کھڑکی سے سر ٹکائے سوچ رہا تھا کہ یہاں کا ایک مشہور عالم جس کی مذہبی علمیت کی دھوم تھی، چھڑی لٹکائے اپنی بھوری بھوری آنکھوں سے حیات کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ بھی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پھاٹک کی طرف بڑھتے ہوئے قفل کے پاس رک گیا اور عالمانہ انداز میں قفل کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اور اس زمین و آسمان کے درمیان جو کچھ ہے، وہ انسانوں کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ اس میں بڑی بڑی حکمت والی باتیں رکھی گئی ہیں اور دانش مندوں کے لیے یہ تحفہ ہیں۔ تم اس کے راز ڈھونڈ نکالو اور وہ راز جب تم پر منکشف ہو جائیں تو فساد برپا نہ کرو۔'' بات ختم ہوتے ہی قفل جھٹکے کے ساتھ کھل گیا اور عالم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے قفل کو ایک طرف پھینکا اور دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا، تھوڑی دیر بعد وہ کمرے سے باہر نکلا، جاتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے ایک قفل نکالا اور اسے زنجیر سے لٹکاتے ہوئے باہر نکل گیا۔ قفل

پر دو چمکتے ہوئے کیل صاف دکھائی دے رہے تھے۔ یہ قفل بھی سابقہ قفل سے کچھ بڑا تھا۔ عالم نے بھی باہر آ کر حیات کی طرف غور سے دیکھا اور کہیں چل دیا۔ اس نے چاہا کہ اس سے کچھ پوچھے مگر اس خیال کو فوراً جھٹک دیا کہ ممکن ہو، کوئی اور بھی آجائے۔

اور ایسا ہی ہوا......... دوسری صبح یہاں کا ایک اہم سیاست داں نظر آیا جس نے ہر ظلم کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ اس نے قفل کو ہاتھ میں لیا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ دیر تک اس کے ادھیڑ عمر چہرے پر سوچ کی شکنیں ابھریں اور پھر اس نے شانے سکوڑ کر کہا" سیاست میں سب کچھ جائز ہے۔" اور قفل جھٹکے کے ساتھ کھل گیا۔ سیاست دان اندر داخل ہوا اور کچھ دیر بعد اس نے پچھلے قفل کو پھینک دیا اور اپنی جیب سے اس سے بڑا اور تین کیل سے آراستہ قفل لگا کر چل دیا۔

اب کے وہ چونک گیا کہ آنے والی شخصیت مشہور سائنس داں کی تھی جو ایٹمی اسلحہ کا سخت مخالف تھا۔ وہ نفیس سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کے جوان چہرے پر ایک عجب اسرار تھا۔ اس نے اپنا منہ قفل کے قریب لاتے ہوئے راز داری کے سے لہجہ میں کہا" کیا ہماری مسکراہٹ میں ہیروشیما کا سارا درد مسکرا رہا ہے؟ اے مخفی بم کے مبدائے پنہاں؟" اور اچانک ہی قفل نے جھرجھری لی اور جھٹکے کے ساتھ کھل گیا۔ سائنس داں اندر داخل ہوا اور کچھ دیر بعد قفل کو پھینک کر اپنا چار کیل والا قفل زنجیر میں پھنساتے ہوئے تیزی سے غائب ہو گیا۔

آج کی صبح بڑی بوجھل تھی، ہوا میں نیم کی کڑواہٹ پھیل چکی تھی، ایک بوجھل پن ٹپک ٹپک کر ذہن کو اور بوجھل کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان لڑکھڑاتا ہوا حیات کے قریب رک گیا۔ یہ نواجوان مجنون تھا۔ کچھ دن پہلے تک اس کا شمار یہاں کے ذہین لوگوں میں ہوتا تھا مگر جب سے اس پر جنون طاری ہوا تھا وہ لوگوں کو روک روک کر راز دارانہ انداز میں

اوٹ پٹانگ باتیں کیا کرتا۔ اس نے پھاٹک کو لات ماری اور قہقہہ لگا تا اندر داخل ہوا وہ قفل کے پاس رونی صورت بنائے ٹھہرا رہا اور بعد میں قفل کو ہاتھ میں لیے کیلوں کو گننا شروع کیا۔ ایک .... دو........ تین........ چار........ اور پھر اس نے قفل کے پاس منہ لگائے اِدھر اُدھر دیکھا اور کہنے لگا ''میں کون ہوں؟''، اچانک قفل کھل گیا اور وہ کمرے میں داخل ہوا، کچھ دیر بعد وہ جذبات سے عاری چہرہ لیے کمرہ سے نکلا اور پانچ کیلوں والا قفل دروازے پر لٹکائے لڑکھڑاتا ہوا چل دیا۔

چار دن بیت گئے مگر اس مجنون کے بعد کوئی اور نہ آیا اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور کمرے کا راز معلوم کرنے کے لیے، وہ اپنے مکان سے نکلا۔

اس کی نظریں بھی خود بخود حیات کی طرف اُٹھ گئیں اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں........ پھاٹک کو پار کر کے........ وہ قفل کو کھولنے کی کوشش میں جھٹکے دیتا رہا۔ مگر قفل کھل نہ سکا، پھر اچانک اسے پروفیسر، عالم سیاست داں، سائنس داں اور مجنون کی حرکتیں یاد آ گئیں اور وہ قفل کی طرف غور سے دیکھنے لگا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''بہارِ عقب، بہارِ عقب''...... تم کوئی پریرنا نہیں ہو''؟ اور قفل جھٹکے کے ساتھ کھل گیا اور وہ دل کی دھڑکنیں سنبھالتا حیات کے کمرے میں داخل ہوا۔ حیات میں داخل ہوتے ہی اس نے دیوانہ وار اس کے ہر حصہ کی تلاشی لینی شروع کی مگر وہ یہ دیکھ کر حیران سا رہ گیا کہ وہاں ننگی دیواروں، خالی محرابوں، خالی کھونٹیوں، کھلی چھت اور سُونے فرش کے سوا کچھ نہیں تھا........ ●●

مدّ عاتِہِ سنگ

ایک رات: وہ سب اتفاق سے ایک ایسی وادی میں ملے، جو دنیاوی ہنگاموں سے ذرا دور سانس لیتی تھی۔ سب کے دلوں میں، ان ہی سوالات کا طوفان تھا جس کی دھمک وہ سالہا سال سے محسوس کرر ہے تھے۔

وہ رات ایک ایسے رشی کی طرح دکھائی دے رہی تھی جو اپنی تپسوی مالا کو ستاروں کی شکل میں بکھرائے اپنی تپسیا کو تج کر، دم بھر کے لیے لیٹ گیا ہو۔

وہ سب چاہتے تھے کہ جلد از جلد اپنی کسک ایک دوسرے سے کہہ دیں۔ مگر وہی جھجھک ان کے دلوں کو گرفت میں لے چکی تھی، جس کی وجہ سے آج تک وہ اپنی کسک کسی سے ایک دوسرے سے کھل کر نہ کہہ سکے تھے۔

مگر آج تو ایک ایسا اتفاق تھا جس کے تاثر سے زمین کا سینہ ایک مکمل سکون کے

جذبہ سے سرشار اور آسمان دیدۂ حیرت سے، ان سب کو تک رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ منظر اس سے زیادہ طرب ناک ہے جب اس کی تخلیق ہوئی تھی۔

آج وہ سب، اپنی اپنی راہوں سے ہٹ کر ایک مشترک پگڈنڈی پر نکل پڑے تھے۔
بہت دیر کے سکوت کے بعد ایک نوجوان بھکشو بڑے جوشیلے انداز میں اُٹھا، اور مشینی انداز میں، ان سب سے کہنے لگا؛

''انسانی دکھ کی مکتی صرف آتما ہی کے سہارے حاصل نہیں ہوسکتی، یہ تو صرف ایک کارن ہے اور یہ شریر ہی اس کارن کا کاریہ ہے، چاہے ہم لاکھ اپنی آتما کو بھگوان کے آدرشوں پر چل کر اسے نروان کی سیماؤں تک لے جائیں پرنتو شریر کو بچانا ضروری ہے اور ایک سگندھ آتما، ایک شریر میں ہی جیوت رہ سکتی ہے، اور شریر، ہم بھکشوؤں کا شریر انسان کے دان ہی کی وجہ سے بچا ہوا ہے اور آج کا انسان، جو ہمارے شریر کو جیوت رکھتا ہے، کتنا ویاکل ہے، کتنا دکھی ہے، کتنا سٹ پٹایا ہوا ہے۔ اسے ایک ایسے نروان کی تلاش ہے جو اس کے دکھوں کا انت کر سکے۔''

ہم سب آج بھگوان سے پرارتھنا کریں گے کہ وہ انسان کے دکھوں کا انت کردے۔ بھکشو اپنے تمتماتے چہرے سے پسینہ پونچھے اپنی سانسیں درست کرنے لگا۔ جیسے ہی اس نے اپنی آنکھوں سے ہاتھوں کو ہٹایا، ایک ہیولی دور کونے سے اُٹھا اور بلند آواز میں پوچھنے لگا۔ اس کی آواز پوری وادی میں گونج گئی۔

''پر بھگوان بدھ نے تو کہا تھا کہ دکھوں کا کوئی انت نہیں ہے۔''

وہ سب چونک اُٹھے۔ لیکن جب آواز کا طلسم ٹوٹا بھکشو نے جواب دیا۔

''دکھوں کا انت نروان ہے جو بدھ کو حاصل ہوا۔''

اسی پر چھائیں نے پھر بلند آواز میں کہا ''نروان تو گیان ہے اور گیان دکھ ہے۔''

''پر گیان آدمی کے پاس کہاں؟'' بھکشو نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''گیان ہی تو کسی پرانی کو آدمی بناتا ہے۔'' پرچھائیں کے لہجے میں مٹھاس تھی۔

نوجوان بھکشو نے بگڑتے ہوئے آواز لگائی۔''تو تم دکھوں کا کوئی انت نہیں مانتے۔''

''انت کیا ہے۔'' پرچھائیں کا سوال وادی میں گونج گیا پھر وہی سکوت ماحول پر طاری ہوگیا۔

رات اپنا چولا بدل چکی تھی۔ اب وہ ایک ایسے آدمی کا چہرہ نظر آرہی تھی جس کے ماتھے پر پسینہ کی بوندیں تاروں کی طرح ٹمٹمارہی ہوں۔

تھوڑی دیر بعد ایک عیسائی راہب سینے پر کراس بناتے ہوئے اُٹھا اور کہنے لگا''انت فنا ہے، جب مٹی مٹی میں مل جائے گی اور کوئی نہ بچے گا۔''

راہب کی بات ختم ہوتے ہی ایک مجذوب نے جواب دیا''مگر ہر چیز فانی ہے قیامت برحق ہے۔'' پرچھائیں تھوڑی دیر مسکراتی رہی اور پھر اس نے مجذوب سے پوچھا ''قیامت کیا ہے؟''

مجذوب نے اپنی شہادت کی انگلی متصوفانہ انداز میں گھماتے ہوئے کہا:

''قیامت۔ بجز اس کے کیا ہوسکتی ہے کہ خدا کو اپنے مضمحل اعضا کو پھر سے توانا بنانے کا خیال ہو۔''

پرچھائیں نے تلخ لہجے میں جواب دیا''مگر خدا تو کہتا ہے کہ اس نے محسوس کیا وہ ہے، وہ تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ فانی نہیں ہے، وہ کبھی نہیں تھکتا اور نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ ہی وہ جاگتا ہے۔ وہ کہتا ہے اور ہوجاتا ہے۔ ہر عمل کا وجود، اس کو، اس عمل کے خاتمہ تک کی خبر دے جاتا ہے۔

یکا یک راہب کو کوئی بات سوجھی وہ کہنے لگا ''اسی خدا کے بیٹے نے ہمارے دکھوں کا سارا بوجھ اپنے سر لے لیا ہے۔ نجات کا فیصلہ صلیب پر پھیلی ہوئی خون کی تحریر سے ہو چکا ہے۔''

''جب سارا بوجھ اُٹھ چکا ہے تو پھر دکھوں کا مسئلہ کیوں اُٹھایا جا رہا ہے اور یہ بے چینی کیوں''، پرچھائیں نے استفسار کیا۔

ایک بار پھر ماحول اسی طرح ساکت ہو گیا جیسے کسی نے اس کے منہ پر طمانچہ مار دیا ہو اور وہ اس طمانچہ کے معنی ڈھونڈنے میں سکتہ زن ہو گیا ہو۔

رات نے ایک بار پھر اپنا لباس اُتار پھینکا تھا، اب وہ ایک ایسی گناہ گار عورت کی طرح دکھائی دے رہی تھی جو اپنے گناہوں کو چھپانے کی ساری تدبیریں ہارے، مسلسل آنسو بہائے جا رہی ہو اور یہ آنسو سارے آسمان پر ٹمٹماتے ہوئے تاروں کی شکل میں، اس کی مکاری کا راز، سرگوشیوں کے انداز میں ایک دوسرے سے کہہ رہے ہوں۔

وادی میں ان چاروں کی سرگوشیاں اُبھرتی رہیں اور بالآخر ان میں سے ایک نے اس کی جانب مڑتے ہوئے کہا:

''تم کون ہو!''

پرچھائیں نے پُراعتماد لہجہ میں جواب دیا۔ ''میں خالق کی وہ تخلیق ہوں جو کبھی مٹی کا نرم گودا اور کہیں ناقابلِ تسخیر چٹان، مجھ میں آگ ہے اور پانی و ہوا بھی، میں زہریلا افعی ہوں اور تریاق بھی، میں تھکتا ہوں، مگر حیات میرے ہی ہاتھوں جدوجہد کا سبق سیکھتی ہے۔ میں سوتا ہوں مگر کائنات کے جاگنے کا علم حاصل کرتا ہوں۔ میں..........''

''بس بس اپنی بکواس بند کرو۔ ہم سمجھ گئے کہ تو کون ہے۔'' وہ پرچھائیں ان چاروں کی جھنجھلاہٹ پر خاموش ہو گئی۔

بھکشو نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا''یہ وہی ہے جو منش کو دکھ کی راہ دکھاتا ہے۔''

مجذوب نے اس کی طرف انگلی گھماتے ہوئے کہا''یہ وہی ہے جس نے کہا تھا کہ میں آگ سے بنا ہوں۔''

تپسوی نے مالا کا جاپ ختم کرتے ہوئے کہا''یہ وہی ہے جس نے سوچا تھا کہ ہم سو ہیں اور وہ پانچ''

راہب نے کراس بناتے ہوے کہا''یہ وہی ہے جس نے صلیب پر کیلیں ٹھنکوائیں۔''

سبھوں نے اس کی جانب غصہ بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ پر چھائیں، ان سے دور، ایک ببول کے سائے میں بیٹھ گئی۔ وہ سب انسان کے دکھوں پر اختلاف کرتے رہے اور آخر میں انسان کے مشترکہ دکھوں پر غور کرنے لگے، بہت دیر چہ میگوئیوں کے بعد اس نے سنا کے انسان کے مشترکہ دکھ صرف تین ہیں۔

بھوک! غم!! اور موت!!!

یہ طے کرنے کے بعد وہ سب، اپنی اپنی عبادتوں میں کھو گئے۔ ماحول پر ابھی کافی اندھیرا طاری تھا کہ اچانک ایک تیز قسم کے نور کی آمد سے وہ سب چونک اُٹھے اور دور کہیں سے خواب ناک آواز اُبھری:

''مانگو۔ میں تمھاری عبادتوں سے واقف ہوں۔''

ان سب کے چہرے ہشاش بشاش اور ایک فتح مندی کا تناؤ ان کی گردنوں سے عیاں ہونے لگا، وہ سب روشنی کی جانب رخ کیے کہنے لگے۔

''اے! دور چھپی لامحدود طاقت! انسان پر سے بھوک کا وجود اُٹھا لے۔ ان کے اندر

سے غم کا تصور ختم کر دے اور موت کا وجود فنا کر دے۔"

تھوڑی دیر کے لیے نور جھلملا سا گیا اور آواز آئی "مجھے تمھاری مانگیں منظور ہیں مگر تمھیں بھی میری ایک شرط ہر مانگ کے ساتھ ماننی ہوگی۔"

"ہمیں منظور ہے" سبھوں نے بہ یک وقت کہا۔

"مگر کیا میری شرائط کو تمام انسان قبول کرلیں گے؟"

"ہم اسے راضی کرلیں گے، وہ اپنے دکھوں کے خاتمہ کے لیے تیری ہر شرط منظور کرلے گا۔" انھوں نے مکمل طمانیت کے ساتھ جواب دیا۔

تو پھر میں انسان پر سے بھوک کو اُٹھالوں گا، مگر اس کے بدلے میں اس کے ہاتھ پیر نکال لوں گا، غم کا تصور بھی انسان کے پاس نہیں رہے گا مگر اس کے عوض میں انسان سے اس کا ذہن نکال لوں گا۔ موت کا وجود بھی فنا کردوں گا مگر اس کے بدلے میں عورت کے لیے مرد کی کشش اور مرد کے لیے عورت کی کشش ختم کردوں گا۔"

پھر روشنی بجھ گئی.......... اور وہ چاروں خوشی خوشی یہ خبر دنیا میں پھیلانے نکل پڑے۔ جاتے جاتے انھوں نے حقارت آمیز نظر پر چھائیں پر ڈالی جو ٹہنیوں کو توڑے، فرش پر بکھری ہوئی گھاس کو سمیٹ رہی تھی۔

اور ایک دن جب پر چھائیں اپنی جھونپڑی کی چھت ڈالتے ہوئے اپنی زندگی کی اگلی ضرورتوں کے بارے میں سوچ رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ وہ تمام لڑکھڑاتے، لہولہان اس نور کی طرف بھاگ رہے تھے جوان پر کبھی وارد ہوا تھا۔ کسی کے ہاتھ پیر زخمی تھے، کوئی اپنا سینہ دبائے چل رہا تھا اور کسی کا سر پھٹ چکا تھا۔

وہ سب تھوڑی دیر تک ہانپتے رہے اور پھر اچانک نور نمودار ہوا۔

''کیا انسان نے میری شرائط منظور کرلیں؟''

اچانک وہ سب پھٹ پڑے''اے لامحدود طاقت! انسان ناشکرا ہے، بھوک بھی چاہتا ہے غم بھی اور پھر موت بھی۔''

نور اور فروزاں ہوا۔ وہ سب اس پرچھائیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔

''اے لامحدود طاقت! وہ کون ہے؟''

''وہ آدمی ہے!'' نور نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

نور غائب ہو گیا اور وہ سب منہ کھولے اسے تک رہے تھے۔ اس نے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ لیا........ چھت مکمل ہو چکی تھی۔ ●●

ہر طرف فاصلے

ہوا بند تھی۔ حبس نما علاقہ چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے ہوئے میری نظریں مسجد کی دائیں طرف کھنڈر نما مکان میں ٹھہرے ہوئے ببول کے درخت پر ٹک گئیں۔ ببول کے خاروں سے اُڈتی ہوئی رات میری بند ہوتی آنکھوں میں اُتر آئی۔ آج سوالات کا انبوہ نسبتاً غیر جسمانی تھا.........

سوال: گراموفون ہینڈل نما گلی کا جزوی خاتمہ مسجد پر ہے۔ مسجد سے عمود گرایا جائے تو رنگ محل ملتا ہے اور وتر کا اختتام کھنڈر پر ہوتا ہے........ فاصلوں کی اہمیت کا تعین کیجیے۔ کیا کیمیائی تعاملات جغرافیائی تبدیلیوں کو واضح کرتے ہیں؟ نیز کھنڈر کی توضیح ارتقائی نقطہ نظر سے ہونی چاہئے اور کسی بھی قابلِ قبول نفسیاتی گرہ سے اپنے جواب کو کھولیے۔ صفائی کے نمبرات میں اس سوال کو شامل سمجھیے کہ آپ کی نظر میں اس پورے سوال کے منطقی و تاریخی عقب میں ممتحن

کا کیا رول ہے؟

جواب: نفسیاتی گرہ، ہینڈل کو نو مرتبہ اُلٹا گھمایئے (یادوں کا اُلٹا پن ماضی ہے۔کھنڈر؟'' کیوں کہ آج نو مارچ ہے۔) (چھ مرتبہ بھی یہی عمل دہرایا جاسکتا ہے۔میرا رول نمبر چھ ہی تو ہے۔)

تاریخی فاصلہ،نو سال۔

جغرافیائی تبدیلی،نو برسات،نو سرما،نو گرما= نو (برسات،سرما،گرما)

اس طرح ستائیس موسم اس تبدیلی کی کرید ہیں اور پھر ستائیس میں بھی نو مقدم رہا۔

کیمیائی تعاملات: نائٹروجن اور ہائڈروجن کے تعامل سے بجلی کڑکی.......

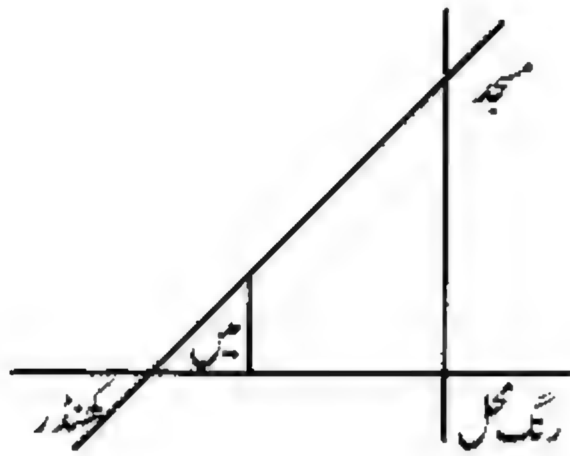
محافظ پانی کا نقطہ انجماد اُبلتا نقطہ ہو کر رہ گیا..........

ہوا کے تیز جھکڑوں سے زیرگی کا عمل قیام پذیر ہوا.......

ارتقائی نظریہ،موجودہ ڈھانچہ (کھنڈر) نو سال قبل ایک توانا جسم (مکان) تھا۔

کیوں کہ

ہر کھنڈر اپنی شکست سے پہلے مکان ہوتا ہے۔اور شکست و فتح کی ہیئتی تبدیلی کا نام ہی ارتقاء ہے۔کوئی بھی تبدیلی، ہر صورت میں خود پر ایسے نقش دھندلائے رکھتی ہے،جس سے اس کے امکانی اصل وجود کا سراغ ملتا ہے۔چوں کہ ہر تبدیلی کش مکش کے کسی زاویہ سے اُبھر کر وجودیت کا پتہ دیتی ہے،اس لیے محفوظ حفاظتیں (رنگ محل) (مسجد) عام طور پر مظاہر ہیں۔ ارتقائی تسلسل (غیر نامیاتی ارتقاء،جمود ہے) مظاہر سے عبارت ہے جو آدمی کی فطری بے چارگی ہے........ رنگ محل انتہائی ابتدا کا اسرار ہو کر بھی یہ حل دے چکا ہے کہ اس میں خود اس کا کوئی رنگ نہیں ہوگا۔مسجد،کھنڈر اور رنگ محل کے بیچ ٹھہری ہوئی لاچاری کی پناہ گاہ ہے۔



زمین ہی مظلوم ہے جو ان تین مظاہر کو اپنے اوپر برداشت کرتی ہے مگر مظلوم میں مجرمانہ جراثیم بھی تو ملتے ہیں۔ انتقام کی صورت اس طرح ہو جاتی ہے کہ فاصلے راستوں سے ترتیب دے کے مٹا دیے جاتے ہیں۔ فاصلوں کے تعین میں کس کس گناہ کو دہرایا جائے مختصر یہ کہ ہمارے تمام عوامل فاصلوں کے تابع ہیں.........

فی الحال

موجودہ کھنڈر میں غائب اور غائب مکان میں موجود 'میں' رہتا تھا......(ہے)، 'تھا' اور 'ہے' کے بیچ ہی سارے المیے سانس لیتے ہیں۔

نوٹ: معاف کیجیے، میں نے جواب میں خود کو شامل کر لیا ہے۔ محض اس واسطے کہ کہیں لاتعلقی معنویت نہ پیدا کر دے۔

.... آپ کو کھنڈر کی اس شکستہ دیوار کے عین بیچ (تھوڑا سا بائیں) جو امیبا (Amoeba) نما دراڑ نظر آ رہی ہے، کبھی میرے مکان کی کھڑکی تھی۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کھڑکی بھی نہیں تھی بلکہ میری آنکھ تھی، جہاں سے میں رنگ محل کے اندر کو دیکھ سکتا تھا۔ رنگ محل کے نواح میں محافظ بھاری پانی ہے جو حالت جمود میں اونگھتا ہے۔ متعدد بار ایسے گواہ دست یاب ہوئے ہیں جنھوں نے آشکار کر دیا ہے کہ یہ محافظ پانی خود سے علاحدہ کوئی وزن اپنے اوپر برداشت نہیں کر سکتا، اگر چہ وزن تقاضا ہی کیوں نہ ہو لیکن جب کبھی اتفاق سے کوئی

وزن گرا تب ہی اس پانی کا نقطہ انجماد اُبل پڑا ہے، اس میں طرح طرح کے نمک ہیں جو اس پانی کو کئی صدیوں سے غیر خالص کر چکے ہیں مگر فیصلہ یہی دیا گیا ہے کہ اس کو کسی بھی عمل سے کشید نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اس میں تیرنے والے نمک حل پذیر ہو کر اسے کھارا کر چکے ہیں۔ اس کھارے پن کو بھی (جو اس رنگ محل میں رہنا چاہتے ہیں) کو یکساں طور سے چکھنا اور جیتے رہنا ہے۔ میں تجربہ کار نہیں تھا کہ میرے احساسات یہاں تشفی کا پہلو گھسیٹ لاتے۔ اس لیے ایک بے حصول شام کو وقت کے موافق دھارے سے ہٹ کر خود کا ہی زاویہ کھینچ کر، میں نے علاحدہ کمرہ بنا لیا، تو بھی میرا تعلق رنگ محل سے منقطع نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ تمام فاصلوں کو ہوا گھیر چکی ہے۔ ہوا جس میں اپنا پن کھوتے ہوئے بھی جینا پڑتا ہے۔ شدید آس کے باوجود میرا تنفس ابھی تک اس خط کو طبعی طور پر نہیں پا سکا، جہاں ہوا میں ہے۔ اس طرح کی سوچ ممکن ہے کہ آپ کو خیالی لگے مگر مجھے علم نہیں ہے کہ آپ بھی اس کیفیت سے گزر چکے ہیں۔ جس کو جان کر بھی جنبش میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ ہوا میں نائٹروجن کا وزن نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حالاں کہ ہوا نائٹروجن سے ہلکی ہے مگر پھر بھی ہر کوئی اس سے مرعوب ہے۔ یہاں تک کہ لامحدود تپش میں شاداں گزرنے والے بھی ہوا سے تجارت کرتے رہے کہ سانس جسموں کی امانت ہے۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ میں نائٹروجن ہوں۔

نوٹ: نائٹروجن، بے انتہا احتیاطی تدابیر سے تیار الکٹرک بلبوں میں قید رہتی ہے .... ایک بے احتیاط شام کو آنکھوں میں دھنک کا انعکاس نہیں تھا بلکہ رنگ محل کے اندر مخفی ایک رنگ جو خود جلتا ہے اور سورج تک سفر کر کے وہاں روشنی میں رہتا ہے۔ میرا سمجھنا غلط نہیں کہ وہ 'ہائیڈروجن' ہے۔ مگر........ مگر اس کا تو کوئی رنگ نہیں ہوتا! ہمیشہ بے رنگ ہی آنکھوں میں رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اپنے پن کا۔ اس اپنے پن کے عمل میں کیمیائی گرفت

فاصلوں کی سازش سے سہم کر غیر ترکیبی ہونے پر تیار نہ ہوئی......... آخری ٹپ ٹپ کے دنوں میں رنگ کی ترکیب اتنی گہری ہوگئی کہ میرے کان میری زبان کو سننے میں محو ہو گئے۔ میں تو ان پیکروں کو بھی خاکستر کر دینا چاہتا ہوں جن کا کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن جو میرے اپنے پن کے خواب میں آکر ارتعاش پیدا کرتے ہیں......... کیمیائی گرفت بڑھتی ہی گئی اور ایک دن بجلی زور سے کڑکی...... جب تک کہ محافظ پانی اُبل جاتا تب تک نقطۂ انجماد کے دن آ چکے تھے۔ پھر بھی نمک حلالی کیسے بھول پاتے، سو پانی اُبل پڑا اور میرے مکان کی دیواروں کو اپنے لگاتار تھپیڑوں سے منہدم کرنے کی سعی کرتا رہا۔ سب سے پہلے کھڑکی دراڑ میں تبدیل ہوگئی اور آنکھ سے گرتے ہوئے آنسوؤں میں سارا منظر دھندلا گیا۔ دیواریں گرتی گئیں۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلا۔ کوئی نہیں چونکا۔ میری تکمیل کی شکست سے خوش کن تھپیڑے فتح کا شور اچھالتے رہے۔ موسم فرقہ پرستی کی طرح نئے نئے رنگ میں آتا رہا۔ ہوا اس وقت بپھری جب جھکڑ کے دن آ چکے تھے۔ وہ ''عمل'' جو ٹپ ٹپ کے دنوں میں ادھورا رہ گیا تھا، ادھورا ہی رہا۔ تیز جھکڑوں نے زیرگی کا عمل قیام پذیر نہ ہونے دیا۔ بیج اِدھر اُدھر ہی مکان کے پاس گرتے رہے اور انگلیاں اکڑتی گئیں۔ (انتقام بھی اپنے رنگ سے ہی لیا) دھوپ میں انگلیاں کس طرح اکڑتی ہیں؟ جو لوگ رنگ محل کو جان چکے ہیں وہ کسی ایک رنگ میں گرفتار ہو کر یہی کرب کسی اور عمل میں اُٹھالیتے ہیں......... لاچاری اتنی بڑھی کہ مسجد کا خیال آیا مگر فیصلہ اس لیے بدلنا پڑا کہ ایک لامحدود فاصلہ تک آواز کیوں لگائی جائے؟ خود کا احساس دوسرے کے لیے کثافت ہی تو ہے۔ مجبوراً دنیاوی ہوشیاری میں، ان فاصلوں کا سفر نتیجے اخذ کرتا رہا۔

سفر: Cosin میں = رنگ محل کھنڈر = رنگ محل = رنگ محل: مسجد

مسجد کھنڈر   مسجد

/ نسبت اتنی کٹھن تھی کہ پاؤں سن ہو گئے۔ پھر کوئی بھی غلاظت اور طہارت کو بہ یک وقت ساتھ نہیں رکھ سکتا۔

Tan میں = مسجد رنگ محل / کھنڈر رنگ محل = مسجد / کھنڈر = مسجد: کھنڈر

مسجد کی موجودگی میں کمرہ کھنڈر بنا۔ پھر کس غلط فہمی کی تاب میں یہ توقع کی جاتی کہ کھنڈر مکان بنے گا۔

Sin میں = رنگ محل مسجد / مسجد کھنڈر = رنگ محل / کھنڈر = رنگ محل: کھنڈر

[{(رنگ محل: کھنڈر)}]

جناب ممتحن صاحب، مجھے صفائی کے نمبرات کی اتنی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ اس سفر میں میں نے ان لوگوں کو دیکھ لیا ہے جو اجتماعی افیم سے رنگ محل: کھنڈر میں بھی خواب دکھانے پر مصر ہیں۔ خوش آئند خواب...... ''اٹھوائے منتخب قطرو، رنگ محل کا نظام بدل کر رکھ دو۔'' آپ کا کیا خیال ہے کہ غلط فہمی کی موت مرنا زیادہ اچھا ہے بہ نسبت خوش فہمی کی زندگی گزارتے رہنے کے؟ میرا خیال ہے کہ آپ بھی اس 'میں' میں خود کو شامل سمجھیے۔ میں ایک اکائی ہے جس کی کہانی بے شمار ہندسوں کی بے اطمینانی ہے یا پھر وہی الاپ۔[''چڑیا چہچہا رہی تھیں۔ نئی صبح مسکرا رہی تھی۔ پاس ہی ندی کا پانی اچھل اچھل کر فضا میں ایک عجیب نغمگی پیدا کر رہا تھا اور جس کو سن کر جسم کا رواں رواں کہہ رہا تھا، اے ماں۔ اے دھرتی ماں تو کتنی رحم دل ہے۔''] (جیٹ چنگھاڑ رہے تھے۔ مکانوں میں تنہائی لاوارث تھی۔ پاس ہی چاروں اور کا منظر بہہ بہہ کر اعصابی تشنج پیدا کر رہا تھا۔ اے ماں۔ اے دھرتی ماں، تیرا کردار بھی اب نیا نہیں

رہا۔“)۔اس طرح یا اس طرف کی بات اب نہیں کہی جاسکتی۔تمام پل ٹوٹ چکے ہیں۔ہر صورت میں آپ اپنے اس بریکٹ میں ہیں۔

ختم شد

کیفیت:”رول نمبر چھ کو ہمیشہ کے لیے سوالات سے برطرف کر دیا جائے کیوں کہ باوجود کڑی احتیاطی تدابیر کے اس نے کسی طرح میرے سوالات کو پہلے سے جان لیا تھا..... مگر میری خواہش ہے کہ اسے صفائی کے نمبرات دیے جائیں کیوں کہ میں خود بھی بریکٹ کے اس طرف ہی ہوں.........“

ہوا قدرے بہہ رہی تھی۔ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ حبس کا علاقہ معدوم ہو گیا ہے۔ ●●

رخشِ پا
(میں کی زبانی)

پھر ایک دن بادل چھا چکے تھے، ہوا میں اتنی تیزی تھی کہ آدمی کے اندر چھپی ہوئی شخصیت گھبرا کر باہر نکلتی جا رہی تھی.........

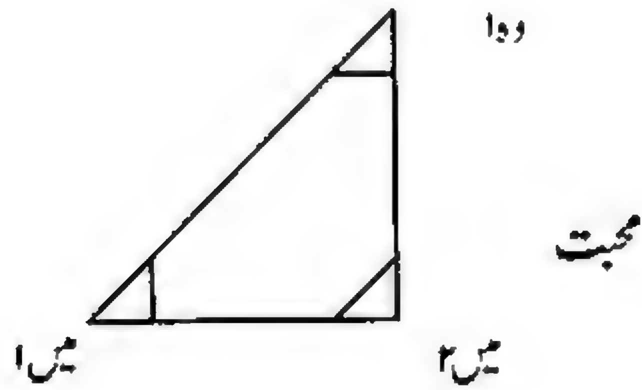
گھر کے آنگن میں ٹھہرا ہوا وہ درخت بڑا کلوروفل زدہ ہو گیا تھا۔کلوروفل میری آنکھوں کے راستے میرے ذہن میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ مجھے بڑی دیر تک اس موسم سے لگاؤ رہا اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ اگر فطرت کوئی جیتی جاگتی شخصیت ہوتی تو اس کے گلے میں اپنے بازو ڈالے میلوں پیدل چلا جاتا۔فطرت کی پرستش میں کہیں نہ کہیں آدمی کی تسکین کا عنصر مخفی ہے۔

اس دن کو لوگ ''صحت کا دن'' کہتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے میں (۱) اور میں (۲) صبح سے مختلف تیاریاں کر رہے تھے۔ میں (۱) میں (۲) کا بڑا گہرا دوست

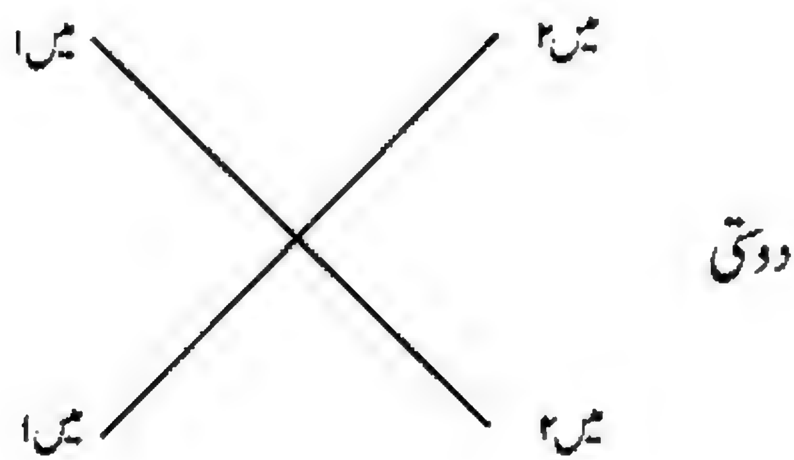
ہے۔اسی تیاری کے سلسلہ میں جب میں (۲) دھوئیں زدہ گھر میں گیا ہوا تھا تو اچانک میں (۱) کو محسوس ہوا کہ وہ (۱) کا زاویہ اشاروں کنایوں سے اس کی جانب بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ میں (۱) کے ذہن میں اچانک لفظ ''گومگو'' پھیلتا گیا۔ اپنے لہجے کے اعتبار سے کسی ظالم دیوتا کی طرح دکھائی دیتا ہے جو انسانی خون چوستا ہے، پھر بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ چوں کہ میں (۱) کو اس وقت لفظوں کی معنویت کا احساس نہیں تھا، اس لیے اس کا زاویہ بھی پھیلتا گیا اور وہ (۱) کے زاویہ میں پیوست ہو گیا۔ ''آج تک کوئی زاویوں سے بچ سکا ہے؟'' میں (۱) کو اس وقت اس بات کا بھی احساس نہیں رہا تھا کہ وہ (۱) اور میں (۲) میں ایک پوتر رشتہ ہے اور میں (۲) اس کا بڑا گہرا دوست ہے دراصل یہ زاویہ ۴۵ بھی اسی وقت شخصیتوں میں داخل ہوتا ہے جب آدمی اس قسم کے احساسات کو محسوس کرے۔

جب میں (۲) دھوئیں کو ہٹاتے ہوئے دھوئیں زدہ گھر سے نکلا تو ایک نقطہ بے علم دکھائی دے رہا تھا۔ میں (۱) میں (۲) باہر نکل گئے۔ بادل گرجنے لگے میں (۱) الکٹرک تاروں میں اٹکے ہوئے پرندوں کو بے معنی طور پر دیکھتے ہوئے اب بھی وہ (۱) کے ۴۵ اور خود کے ۴۵ کے زاویے سے لطف اٹھانے میں محو تھا اس کے کندھوں کو دھکا دیتے ہوئے میں (۲) نے کہا ''تیز بارش کتنی بھلی لگتی ہے۔'' میں (۱) سٹ پٹا کر سامنے Octroi Box (چنگی خانہ) میں گھس گیا۔ میں (۱) اپنی قمیص اتارے میدان میں بھیگتا ہوا چلا گیا۔ اچانک میں (۱) کو اس بات سے جھرجھری سی آ گئی کہ کہیں میں (۲) کو ان کے زاویوں کا علم تو نہیں ہو گیا؟ میں (۱) کشمکش کی آگ میں جلتا رہا اور اس کی نظر بار بار الکٹرک تاروں میں ڈولتے ہوئے ایک قطرہ پر جا رکی، قطرہ کے گرنے کے عمل کا اس کی نظروں نے تعاقب کیا اور جب وہ قطرہ کہیں گم ہو گیا تو میں (۲) بھی بھیگتے ہوئے شرابور جسم کے ساتھ box میں پھر سے داخل ہوا لیکن اب وہ ایک

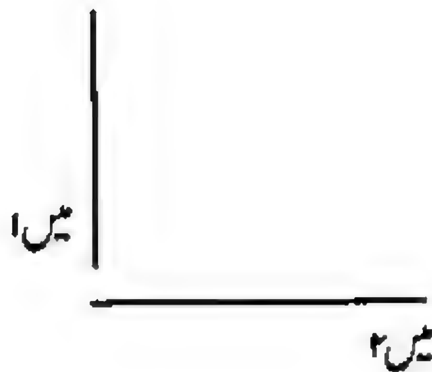
نقطہ بے علم نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ میں (۱) کو احساس ہوا کہ ''صحت کے دن'' اس نے ایک بیماری پال لی ہے۔ جو ۴۵ کا زاویہ رکھتی ہے۔ ''زاویوں کے علم کے ساتھ ہی میں (۱) میں (۲) کے ذہنوں میں الفاظ کے معنی جدا ہوتے اور مٹتے ہوئے دکھائی دیے۔



جب بھی ان زاویوں کا اتصال ہوا ہے مثلث ان کا مقدر بن چکا ہے لیکن اس مثلث کی انوکھیت کا ناجائز زاویہ ۹۰ ہے جو میں (۱) وہ (۱) کے ۴۵ کو دیکھ کر وجود میں آیا ہے۔ اس لیے یہ مثلث معنی خیز ہے۔ میں (۱) میں (۲) کی دوستی اس مثلث سے پہلے یوں تھی۔



اب یوں ہوگئی ہے۔



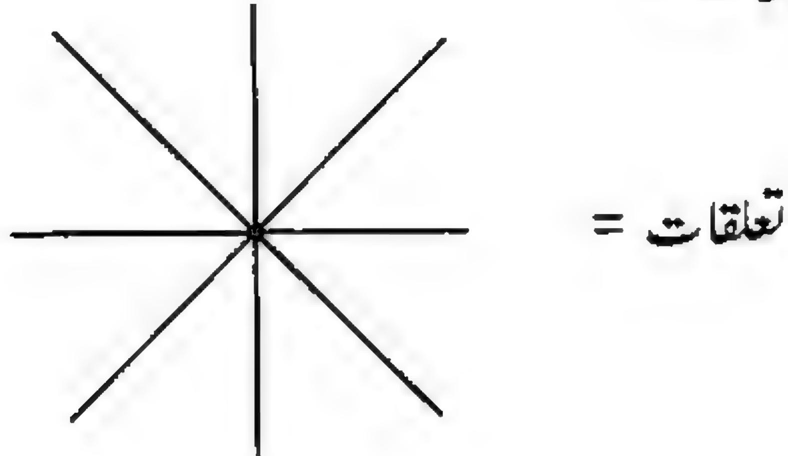
ان لکیروں کے خلا میں وہ(۱) آ گیا تھا۔خلا کا پیدا ہو جانا ایک فطری رشتہ کی آ گاہی ہے........میں (۲) وہ (۱) ایک فطری رشتہ سے بندھی دو خون کی نالیاں ہیں اس لیے میں (۲) کی میں (۱) سے برہمی جائز اور کھری تھی۔مگر میں (۱) وہ (۱) کا رشتہ بھی محسوساتی تھا۔ محسوسات فطرت سے کبھی بھی اور کہیں بھی پست ہو سکتے ہیں۔اس بات کا تعین نہیں ہو سکا ہے۔

کالے اور سفید رنگوں کے بیچ ۴۵ کا زاویہ مستحکم ہوتا گیا اور اس میں اس قدر اتصال پیدا ہوا کہ مثلث میں تناؤ آ گیا۔مثلث کے وجود نے X کے وجود کو یکسر ختم کر دیا تھا اور روز بہ روز کے سائے لمحہ بہ لمحہ لانبے ہوتے گئے۔

آنگن میں ٹھہرا ہوا کلوروفل زدہ درخت اس قدر پھیل چکا تھا کہ سورج کی روشنی اس کے پتوں میں اسیر ہو کر رہ گئی تھی۔میں (۱) یہ سب دیکھتا رہا۔میں (۲) چوں کہ ایک اجتماعی آدمی تھا اس لیے اپنے تناؤ کو قوت دینے کے لیے اس نے ان زاویوں کے درمیان وہ (۲) کو بھی گھسیٹ لیا،وہ (۲) وہ (۱) میں ایک خونی رشتہ ہے اور اس طرح میں (۲) وہ (۱) ایک ہی شاخ وہ (۲) کے پھول ہیں۔میں (۲)Androcium اور وہ (۲)Gynacium کی جبلت ہیں۔میں (۲) وہ (۲) نے ہر طرح سے میں (۱) کو ۳۵ کے زاویے پر آ جانے کے لیے مجبور کیا مگر لاحاصل۔اب انھوں نے وہ (۱) کو اپنی کمند میں گرفتار کرنا چاہا۔وہ (۱) پھڑ پھڑا تا رہا مگر ۴۵ کے زاویے نے اس کو اُڑان کے لیے تقویت پہنچائی مگر وہ خود بھی ۳۵ کا زاویہ نہ ہو سکا۔اب وہ (۲) بھی میں (۲) کی طرح ۹۰ کا زاویہ ہو گیا اور ان دونوں نے غصہ میں درخت کے کلوروفل زدہ پتے چبائے۔

ایک تیز دوپہر دھوئیں زدہ گھر سے آگ کے شعلے اُٹھ رہے تھے۔میں (۲) وہ (۲)

نے طے کیا کہ اپنی کمند میں اخلاقی اجسام ہم (۱) ہم (۲) کو لائیں۔ ہم (۱) اور ہم (۲) کے تعلقات یوں تھے۔



میں (۲) وہ (۲) نے ۴۵ کے زاویہ کو ہم (۱) ہم (۲) کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ ان دونوں کو یقین ہو گیا کہ میں (۱) ہی ۴۵ کے زاویہ کا خود ساختہ علم بردار ہے۔ ہم (۱) کو بہت تکلیف ہوئی، ہم (۱) نے ایک کہاوت ''جس تھالی میں کھاؤ اس میں چھید نہ کرو۔'' کو ہر رات سوتے وقت میں (۱) کو رٹایا تھا۔ میں (۱) نے اپنے عزیز ہم (۱) کی کہاوت کو توڑ کر بغاوت کی تھی۔ ہم (۲) کو اس بات سے تکلیف پہنچی تھی کہ انھوں نے بھی ایک محاورہ 'محبت میں سب کچھ جائز نہیں ہے۔' وہ (۱) کو سکھایا تھا وہ (۱) ہم (۲) کا عزیز ہے۔ میں (۱) نے اپنے مشترکہ زاویہ سے اس دیوار کو ہلا دیا تھا جن کی بنیاد میں ہم (۱) ہم (۲) نے اپنے کئی Androcium, Gynacium سے باہم بدل لیے تھے۔ اس کے علاوہ ہم (۱) ہم (۲) کو سب سے زیادہ چڑ انفرادی پسند کے زاویوں سے تھی۔ وہ دونوں اجتماعی چوریوں سے ایک نیا زاویہ بنانے کے قائل تھے جو زاویہ سے زیادہ جامد نقطہ کا کام کرتا ہے۔ پھر ان سبھوں نے اپنے اصولوں کے دائرے سے زاویوں کو قید کر لیا اور وہ یوں ہو گئے۔ لفظوں کی ہیئت بدل گئی۔

میں (۱) = ۴۵

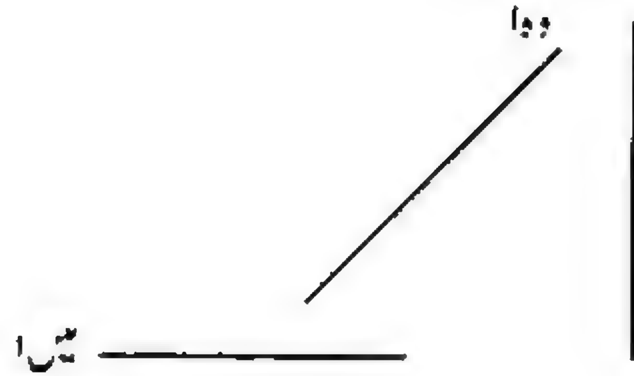
میں (۲) = ۴۵

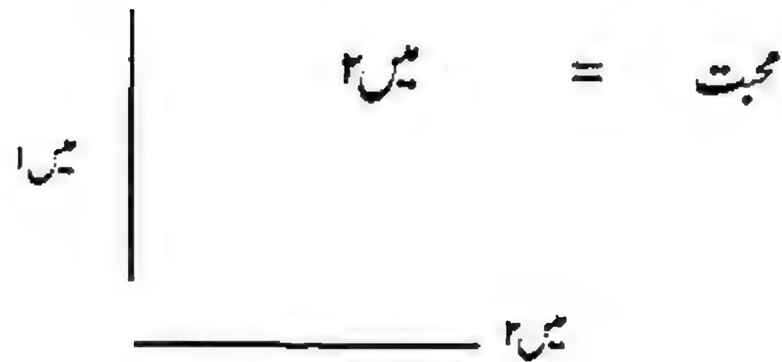
وہ(۱) = ۹۰

وہ(۲) = ۹۰

ہم(۱) = ۷۰

ہم(۲) = ۷۰





میں(۱) وہ(۱) نے اپنے زاویہ کو قید ہوتے دیکھ کر محسوس کیا کہ وہ دونوں کسی تاریک جزیرے میں قید ہیں اور ان کے درمیان ہم(۱) ہم(۲) نے ایک خطرناک سمندر لا کھڑا کر دیا ہے۔ اس سمندر میں ہم(۱) ہم(۲) نے اپنے اجتماعی اصول کے خطرناک جانور ڈال دیے تھے، جن کا زہر جھاگ کی شکل میں ان دونوں کی جانب بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں(۱) وہ(۱) پھر بھی اپنی اس چھوٹی سی لٹی ہوئی ۴۵ درجہ کی بستی میں مست تھے۔

ایک دن ''پوتر زنجیروں'' کا تہوار لایا گیا اور میں(۱) وہ(۱) ==== ہو گئے، چوں کہ اجتماعی حیثیت ==== کو کوئی اہمیت نہیں دیتی اس لیے ہم(۱) ہم(۲) میں(۲) وہ(۲) مطمئن ہو گئے اور دن بہ دن میں(۱) وہ(۱) یوں ہوتے گئے۔

تب میں (۱) کو وہ (۱)، وہ (۱) کو میں (۱) کا زاویہ ایک علاحدہ روپ میں دکھائی دینے لگا۔ اب زاویہ نگاہ بدل گیا تھا لیکن ۴۵ کا زاویہ پھر بھی انھیں ایک چٹان کی مانند دکھائی دیتا، چوں کہ میں (۲) بھی ہم (۱) ہم (۲) اور وہ (۲) کی طرح اب ۴۵ کے زاویے کے وجود کو ختم سمجھنے لگا تھا اس لیے وہ میں (۱) کو ایک سمجھوتہ کے تحت X کی طرف راغب کرنے لگا اور اچانک ہی میں (۱) وہ (۱) کو لفظوں کی معنویت بدلتی دکھائی دی ہے۔

محبت = اپنی انتہائی شکلوں میں پراسرار ہے۔

دوستی = ضرورت

سمجھوتہ = لوگ خون کے بعد اس ہتھیار کو استعمال کرتے ہیں۔

نفرت = فانی ہے

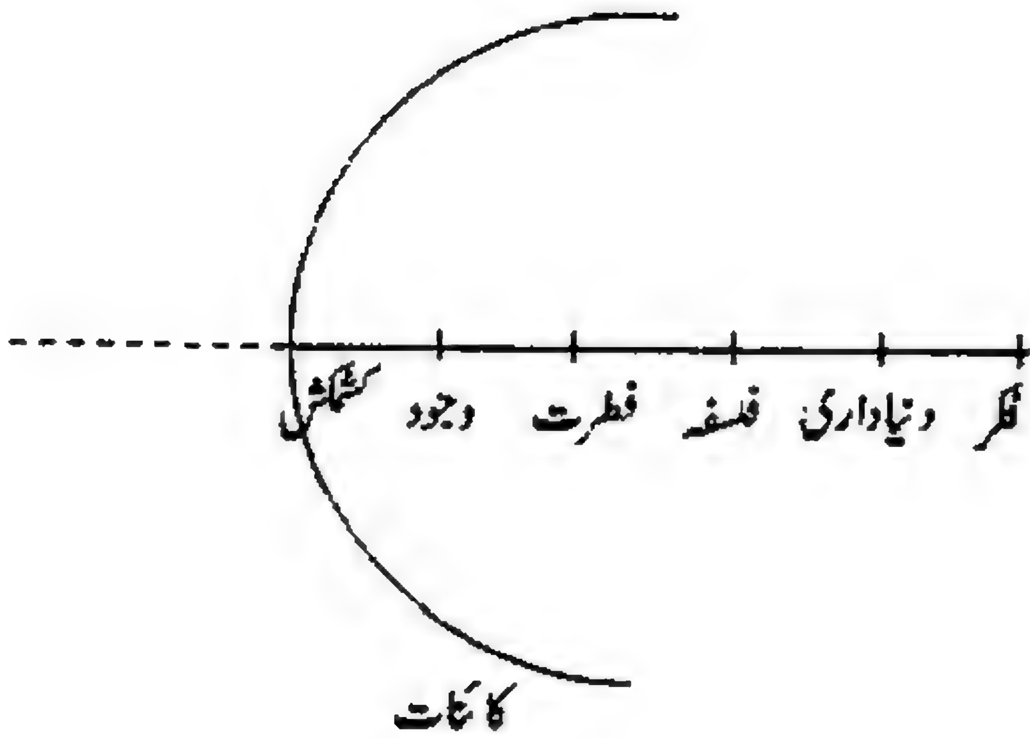
تعلقات = غیر فانی

لیکن جب میں (۱) وہ (۱) آنگن میں پھیلے ہوئے درخت کو دیکھتے ہیں تو ان کے ذہن میں کلوروفل نظروں کے راستے سے بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور انھیں ان باتوں کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اگر نہیں مل سکتے تو ایک لامحدود سرحد تک ایک ہی رفتار کے ساتھ اپنے اندر اپنے ۴۵ کے زاویہ کا درد لیے ہمیشہ سفر کرتے رہتے ہیں اور اس سے بڑھ کر ابدیت کیا ہو سکتی ہے۔ ●●

عکسِ فنا

فرض کیجیے:

وہاں، ایک تنویمی ماحول میں ایک ایسی تختی رکھی ہوئی ہے۔



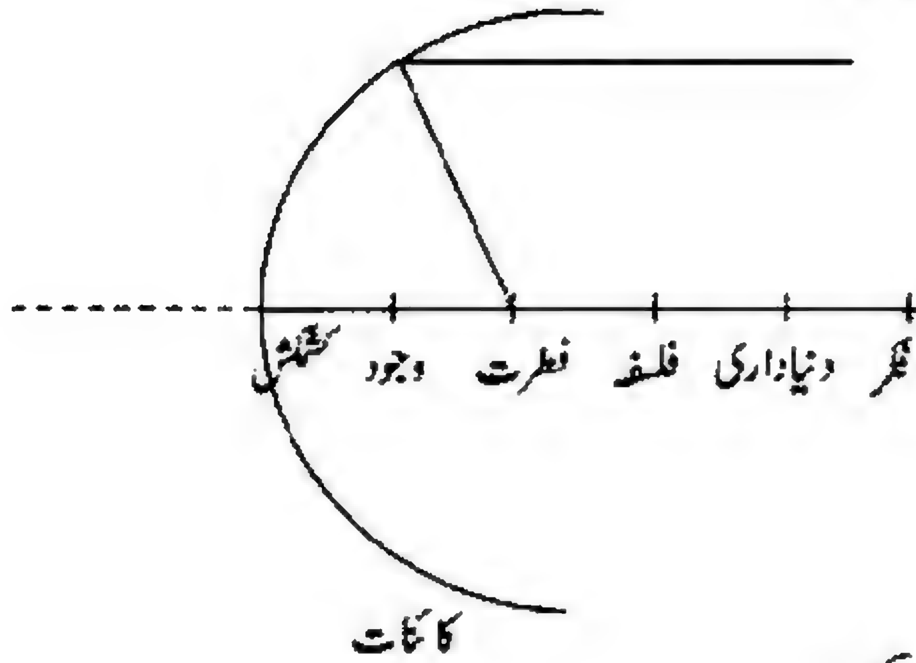
ممکن ہے وہاں کچھ اس قسم کی بات ہوئی ہو۔

''تم صرف ایک کرن ہو چوں کہ ہم مبداءِ نور ہیں ہم نے کچھ راز تم میں رکھے ہیں جو تمھاری فطرت ہے۔ ہم تمھیں تمھاری اس فطرت کا راز نہیں بتا سکتے لیکن یاد رکھو ہم اس راز سے خوب واقف ہیں ہم سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اس فطرت میں رہ کر جو کچھ کرو گے وہ ہماری ہی مرضی ہوگی مگر اس کے علاوہ جو تم کرو گے اس کو ہم پکڑ لیں گے ہماری پکڑ سے ڈرو کیوں کہ فنا و بقا ہمارے ہاتھ ہے۔ ایک دن اور وہ دن مقرر کیا گیا ہے کہ تم یہیں لوٹ آؤ گے، اس دن ہم تمھارا چہرہ دیکھیں گے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ اس وقت تمھارا چہرہ کیسا ہے۔ ہم نے چاہا کہ تمھیں اس لامحدود سرحد سے کائنات پر پھینکیں اور کائنات ہم نے ہی بنائی ہے جو تمھیں نظر آرہی ہے۔ خود دیکھ لو کہ ہم نے اس میں ایک وسیع خط کھینچا ہے جس کی کوکھ میں ہی کشمکش ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم نے ایسا کیوں کیا ہے۔ اس خط پر تمھیں کئی فریب ملیں گے۔ یاد رکھو فطرت ہی تمھاری اصل جگہ ہے۔ فطرت پر رہ کر ہی تم اپنا اصل چہرہ دیکھ سکو گے۔ اس لیے کائنات کو آئینہ بنایا گیا ہے کہ تم اپنا چہرہ دیکھ سکو۔ مگر اس جگہ سے ہٹ کر تم اپنا چہرہ بھول جاؤ گے اور سمجھ نہیں پاؤ گے جو چہرہ تمھیں اس جگہ سے نظر آئے گا، مسخ ہوگا۔ ہم مسخ چہرہ پسند نہیں کرتے، لیکن ہم ہر چیز پر قادر ہیں۔''

پھر تختی ہٹا دی گئی اور تنویمی ماحول دھندلا گیا۔

اسے جھٹکا سا لگا۔ اس نے پہلی دفعہ سوچا وہ کوئی ہے جو محدود ہے کوئی ہے جو لامحدود ہے اور......... اسی ثانیہ وہی آواز: ''تم گر رہے ہو اس کائنات میں جو آئینہ ہے اور تمھارے لیے رزم گاہ، خوب یاد کر لو فطرت ہی اصل ہے تم صرف ایک کرن ہو چوں کہ ہم مبداءِ نور ہیں اور ہم ہر چیز پر قادر ہیں۔'' وہ ہچکولے کھاتا سنتا رہا، تنویمی ماحول یکسر ختم ہوگیا۔ کسی چیز کے ٹکرانے سے ایک لمحہ پہلے اس کے ذہن میں ''کیوں'' اُبھرا پھر ایک جگہ ٹھہر کر اس نے اپنی منحنی

شکل آئینہ میں دیکھ لی۔



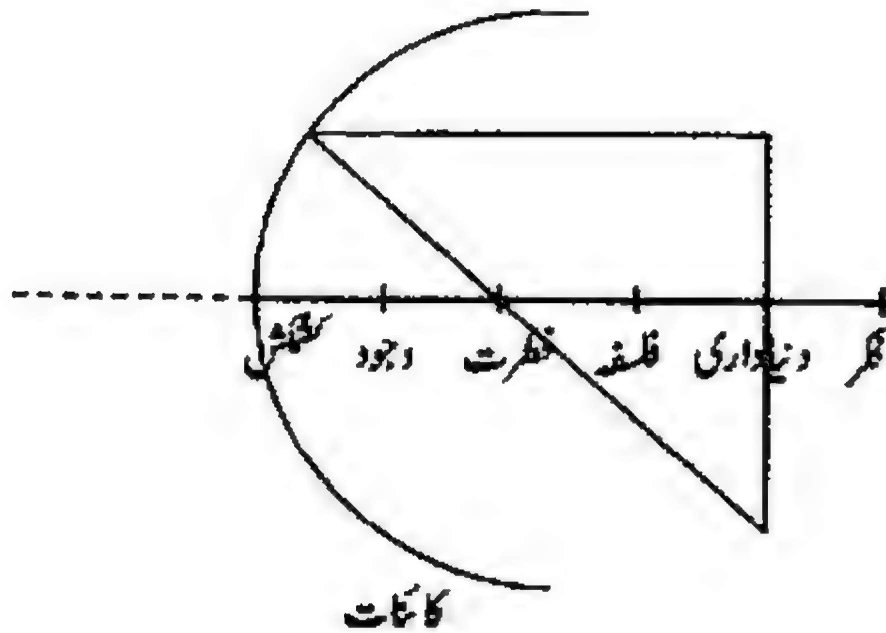
یقین کیجیے:

''اس نے محسوس کیا وہ مٹیالہ ہے۔''

لیکن اس نے دیکھا اطراف کالے رنگ بھی ہیں اور سفید بھی، لال نارنجی بھی ہرے بھی، نیلگوں زرد........ اور گڈمڈ کرتے ہوئے کئی رنگ، ایک حسد پیدا ہوا، وہ کیوں کالا، سفید نارنجی........ اور زرد نہیں ہے؟ ایک تجسس اُبھرا، کیا وہ ایسا ہو سکتا ہے......؟

ایک ہمت پکاری: وہ ایسا ہو سکتا ہے۔

پاؤں میں حرکت، دماغ میں بغاوت، انگ انگ میں ہوس اور دل میں جستجو لیے وہ بڑھ گیا، فطرت سے ہٹ کر وہ ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔



آوازیں:

تم میرے بیٹے ہو

میرا ایک باپ ہے اور ایک ماں

میں بھی باپ ہوں

میرا ایک بیٹا ہے

میری ایک بیوی ہے

میری ایک محبوبہ بھی ہے

میرا ایک ملک ہے

مجھے ایک خاص ڈھنگ سے عبادت کرنی ہے

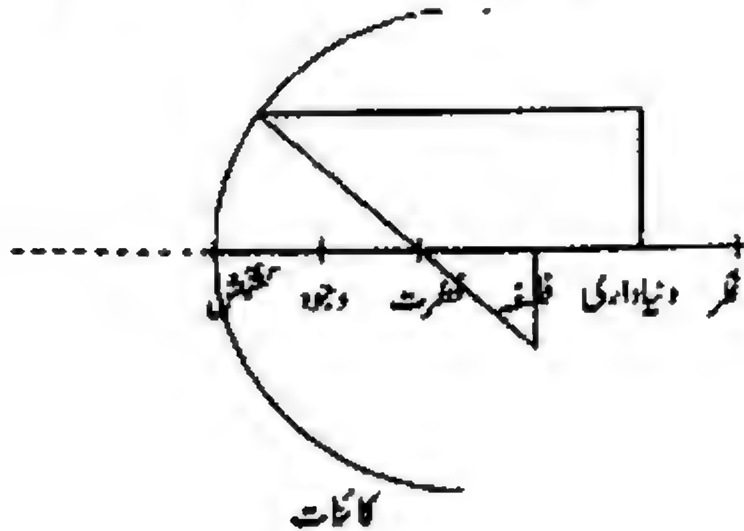
انسانیت، حیوانیت، شیطانیت، روحانیت، جسمانیت

نفسانیت، جنسیات..........ت اور

وہ تنگ آ گیا۔

اس نے دیکھا وہ اُلٹا ہو گیا ہے اگرچہ یہاں اس کے قد و قامت محفوظ تھے۔" پھر بھی مطمئن نہ ہوا اور بیزار ہو گیا۔ اس نے سوچا وہ رنگ کہاں ہیں؟

وہ ہٹ گیا اور آگے کھڑا ہو گیا تاکہ یہاں سے اپنے آپ کو دیکھ سکے۔



تشریحات:

''ماں باپ کی خدمت میں دین ہے کیوں کہ انھوں نے تمھیں جنم دیا ہے۔ پالا پوسا اور جوان کیا ہے۔ اپنا سب کچھ قربان کر کے تمھیں ہر قسم کی سہولت فراہم کی۔ تمھاری خدمت کوئی احسان نہیں ہے اور اس بات کا رتی برابر احساس تمھیں نہیں ہونا چاہئے۔ مقدس رشتوں کے ساتھ لائی گئی یہ عورت تمھاری شریک حیات ہے۔ اب کوئی اور عورت تمھارے لیے حرام ہے۔ وفاداری کا یہی اُصول ہے جس سے ازدواجی زندگی بھی خوش گوار ہو سکتی ہے۔

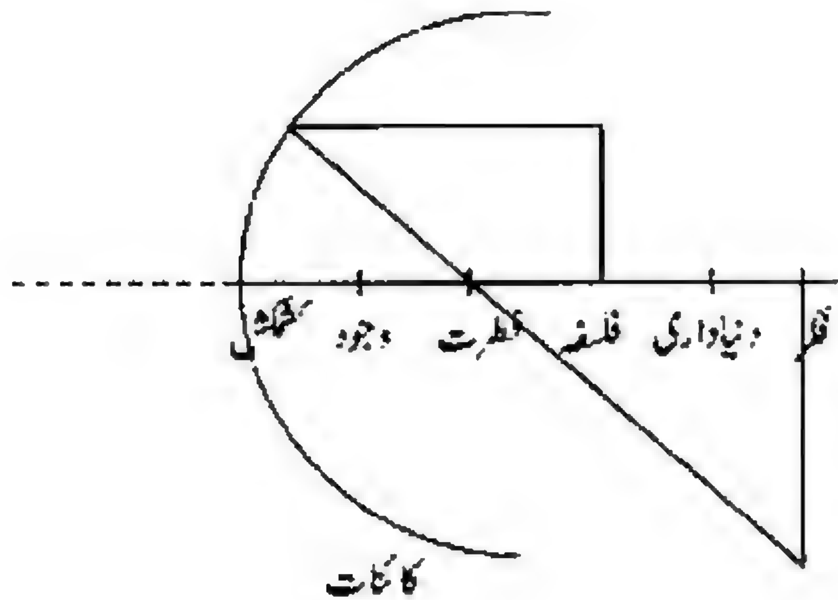
محبت لمس نہیں احساس ہے۔ لمس تو میری جان جسم سے وابستہ ہے اور احساس روح سے جنم لیتا ہے۔ ہم ایک نہیں ہو سکے اس سے ہماری محبت میں کوئی جھول نہیں آ سکتا۔ محبت تو اعتماد کے سلسلوں سے بندھی گئی ہے......... اچھا تو کل اسی جگہ ملاقات ہوگی......... خدا حافظ میرے محبوب۔

کل کو اور کوئی انگلی نہ اُٹھائے کہ یہ میری اولاد ہے۔ کچھ کرنا چاہئے، آخر میں اس کا باپ ہوں اور وہ میرا جگر کا ٹکڑا۔

یہ سچ ہے کہ تمھیں اس کا احساس ہے مگر احساس وہ ہے جو کچھ جغرافیائی حد بندیاں رکھتا ہے۔ حب الوطنی تمھارا ایمان ہونا چاہئے اور ایمان کو محصور ہونا چاہئے۔ اس طرح اسے کھلا مت چھوڑو، دیکھو ایک مثال سنو۔ یہ مت سوچو کسی اور جگہ، تاب کاری سے ایک زبان زہریلی ہوگئی ہے۔ بلکہ یہ دیکھو یہاں کتنی زبانیں دھول سے بدمزہ ہیں۔ احساس کی غلامی ہی حب الوطنی بن جاتی ہے۔

یہیں پر وہ ملے گا کیوں کہ سیدھا اور صحیح راستہ یہی ہے۔ بس اسی طریقہ کار کو روبہ عمل لاؤ اور عبادت کرو، اس کی، جو ہر جگہ ہے۔

............ت، یہ لفظ مجھے تابوت لگتا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ یہی زندگی کی نیرنگیاں ہیں اور۔ وہ تشریحات کی ضمنی تعریفوں سے ہی پریشان ہو گیا، اس نے دیکھا وہ الٹا ہو ہی گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی جسامت گھل گئی ہے۔ وہ سامنے نکل آیا اور ایک جگہ کھڑا ہو کر اس نے دیکھا:



اسراریت:

''سب بھائی ہیں کیوں کہ ایک مادہ ایک ہی خون اور ایک ہی روح رکھتے ہیں۔
مادّہ: مادہ کبھی فنا نہیں ہوتا، تاہم ہمیں نظر نہیں آتا، مادہ دراصل قوت ہے۔ توانائی ہے۔ اس لیے مادیت ہی توانائی اور قوت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ جن کے پاس یہ سب ہوگا وہی کامل انسان ہوں گے۔

خون: جب خون سے خون کا اتصال ہوتا ہے اگر چہ وہ اپنا تھوڑا بہت رنگ کھو دیتا ہے مگر ایک تیسرے خون کا وجود قائم ہو جاتا ہے جن میں ان دونوں کی خصوصیات کسی نہ کسی نہج سے زندہ ہوتی ہیں اور وراثت کا یہ سلسلہ کبھی نہیں مرتا۔ وہ لاکھوں خون اپنے اندر پہلے، دوسرے، تیسرے .... خون زندہ رکھتا ہے اس لیے خون اچھا ہو تبھی وراثت اچھی ہوگی۔ خون کے اچھے ہونے کا واحد ذریعہ 'یقین' ہے جن کے پاس یہ سب ہوگا وہی انسان ہوں گے۔

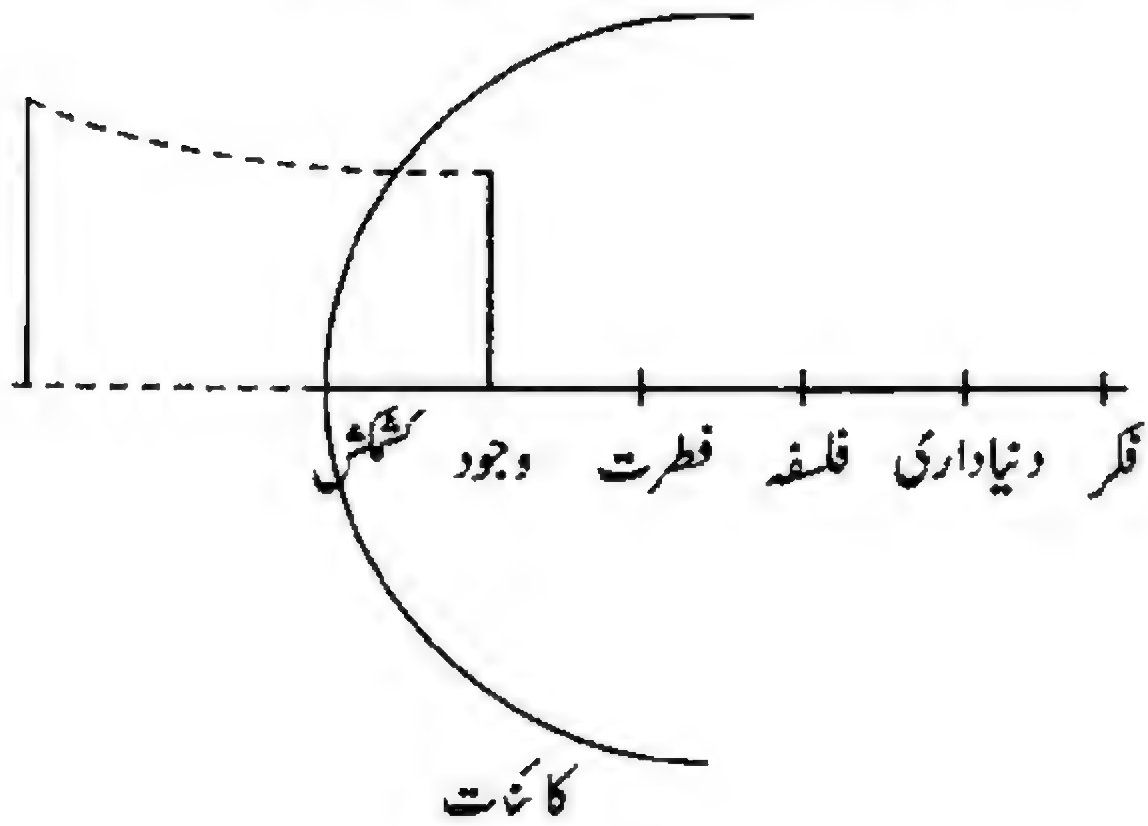
روح: ہیت کا بدلنا اور دراصل فنا ہی ہے۔ مادہ اور خون اپنی ہیت بدلتے رہتے ہیں

توانائی کے بغیر مادہ اور یقین کے بغیر خون محتاج ہیں مگر روح نہ کسی کی محتاج ہے اور نہ اپنی ہیت بدلتی ہے۔ وہ مکمل آزاد ہے۔ چوں کہ وہ بے حس نہیں ہے اس لیے متاثر ہوتی ہے۔ وہ تقویٰ ہی ہے جو روح کو متاثر نہیں ہونے دیتا جن کے پاس یہ سب ہوگا وہی انسان ہوں گے۔

اس اسراریت کے کھلے پن سے اس کا سر چکراتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنی ہیت بدل چکا ہے اور اپنی جسامت سے کہیں زیادہ بڑا ہو گیا ہے۔ مگر الٹا ہی۔

وہ اکتا گیا۔

وہ سامنے نکل آیا اور اس جگہ کھڑے ہو کر اس نے دیکھا۔



محویت:

یہاں پہنچ کر اس نے دیکھا سب رنگ ایک ہی ہیں اور وہ سب اسی کے لیے ہیں۔ وہ جس رنگ کو چاہے اوڑھ سکتا ہے۔ یہاں پہنچ کر اس نے جانا وہ 'میں' ہے اور اس میں اس نے ہزاروں آوازیں سنیں جو اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئیں۔

یہاں اسے یقین ہو گیا کہ وہ صرف اس 'میں' سے محبت کرتا تھا اور اسی کے ساتھ اس

کی وفاداری رہی ہے۔ جس کی کوئی جغرافیائی حد نہیں ہے۔ یہاں اسے عرفان ہوا اس نے محسوس کیا کہ وہ ہے اور چوں کہ وہ ہے اس لیے وہ رہے گا۔

یہاں اس نے مانا وہ کئی بار اس ''میں'' کی عبادت کر چکا ہے اور کئی بار اسے ٹھوکر لگائی ہے۔ یہاں اسے احساس ہوا کہ 'ت' اس کی تنہائی میں اسیر ہے۔

ساری کائنات اس کے اندر غلاموں کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پچھلے سفر کی حکایتیں یاد آ گئیں۔ اسے اپنے آپ پر غصہ بھی آیا اور جھلاہٹ بھی ہوئی کہ اس نے اسی راہ پر اپنے قدم اول اول کیوں نہ اٹھائے۔

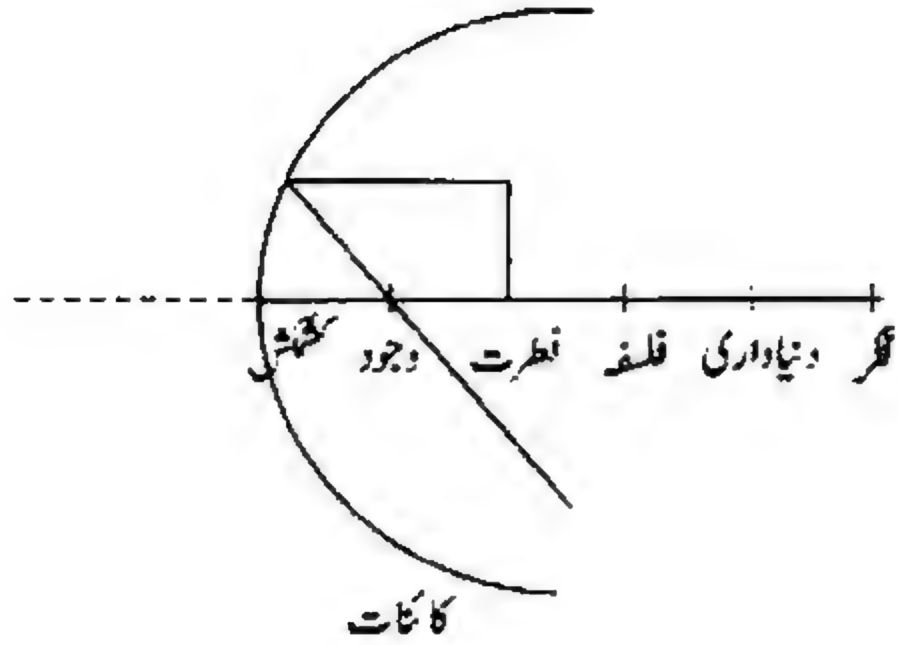
یہاں وہ سب کچھ جان چکا تھا۔

لیکن جب اس نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھنا چاہی تو وہ حیران رہ گیا وہ اس کی صورت ہی نہ تھی۔ شاید کائنات کا آئینہ اس کے عکس کو نہیں گھیر سکا تھا۔ پھر بھی اس لمحہ اسے یقین ہو گیا کہ وہ جہاں بھی ہوگا بلند اور سیدھا ہوگا۔ وہ بہت خوش تھا۔

ایک دن وہ اداس ہو گیا: سالہا سال کی مدت میں اس نے دیکھا وہ بالکل ہی اکیلا ہے۔ اس کے اطراف ایک مہیب تنہائی سانس لے رہی ہے۔ اس نے سوچا کہ پھر بھی مجھے کچھ زیادہ رنج نہیں ہے مگر؟!؟!؟!

ایک فتور اس کے ذہن میں اُترا: آخر وہ کیسا لگتا ہے۔ اتنے سالوں بعد اس کا چہرہ کیا ہو گیا ہے۔

اور وہ ہٹ گیا۔ اسی جگہ ٹھہر کر اس نے اپنی صورت دیکھنا چاہی مگر وہ لامحدود سرحد تک پھیلتا گیا۔



حقیقت: اس کائنات سے ٹکرانے سے ایک لمحہ پہلے، اور اس کو چھوڑنے سے ایک لمحہ پہلے، وہ مکمل 'کیوں' بن گیا تھا۔ ●●

کابوس

قدیم بنجر میں آج رات کے ٹھیک آٹھ بجے: ایک عرصہ سے قدامت پسند کابوس نے شیشہ در شیشہ کلوروفل نگلنا شروع کر دیا ہے، ....

خودفریبی کے عنکبوتی جالے کو محض معکوس اور اندھی فنا کی یلغار کے مقابل ایمان نہ کرنے کے غم میں ہم قانون بن گئے تھے۔ 7 سال سے روگ، گھن، ادھورے مکان، قانون، شہر، دوشیزگی غلیظ خون، بے حسی اور قدامت کی سخت گیر تکرار، جانے پہچانے سیاہ سورج کے درمیان ہو رہی ہے۔

دہلی: فی الوقت، زہر، خاموش نرگسیت کی گدلی پیلاہٹوں کو اوڑھے گلی گلی تلملا رہا ہے۔ چہار سو تاریکی کا ویت نام ہے۔ جس میں ہم پہلی بار نہیں ملے ہیں۔ کبھی کبھی ایک جاں گسل دھندلی سی نڈھال تھرتھراہٹ اس تیرہ فضا میں کانپتی ہے اور تعبیر کی حق تلفی روشنی ذہن

کے تمام حکایت آشوب راستوں میں پھٹ رہی ہے...... تو لیے میں لپٹی رونقیں، فٹ پاتھ، روشن کنکریٹ، سڑکیں، آنگن، مجلوق چہرہ...... ساری چیزیں ہاتھ منہ دھو چکی ہیں۔

چہار جانب سکوت۔

گرم آوارگی سے محروم چپ ہواؤں میں غوطہ زن ہے۔ پانی برس چکا ہے رگ و پے میں وقت کے عذاب لمحات کی آمد و رفت رک گئی ہے۔'' عجب اعلان سن رہے ہو'' وئی آواز تھی۔ جانے کیا بات ہے کہ سفر کی اضافی یادیں محدب راہوں کی خوابیدگی اور اٹھتے قدموں کی آہٹیں...... ہر گھڑی یہ گمان ہوتا ہے کہ ہم کسی اور طرف ہی نکل آئے ہیں۔

''ہم کہاں ہیں؟'' دھیرے سے اسفنج پھیر کر پسینہ پونچھ ڈالو، سفر تھمتا نہیں ہے۔

اس وقت سفر چلتے رہنے کا مطلب یہ بھی تھا کہ مبادا دم بہ خود دائمی تعبیر کے محدود تخلیے کا دھواں دیا جائے۔ کیوں آرام اور وہم کے درمیان قیام سے انتقال کا حشر برپا صبر اداس تھا۔ اب یہ اتفاق کسمساتا ہے۔ ہمارا ملک عجب عبرت سے نشیب میں سرحدیں ملا کر چلتا ہے۔ ہمارے ملک کی ڈھول بردرا بھیڑ کے لعن طعن، فساد، آرتھو پیڈک اتحاد فشر زدہ اعصاب اور زوال آمادہ ذہن سے سمندر دور ہے۔ ان تمام ذلتوں فشار حماقتوں کی شریانیں ہمارے فعال ریشے ریشے میں جھلکتی ہیں۔ ابھی تک شعبدہ سرخ روشنی آسودہ شب لکیروں کے حاشیے میں، خواب در خواب عفریت کو نئے سرے سے، منصف بشارت دیتی ہیں کہ جہاں کبھی ہم بے ارادہ فرض کیے گئے وہیں عادتوں، عمروں، لا علاج مقاصد، سیاہ آفات کی ٹھٹھرتی چنگاریوں کے نازک بدن غنودگی کا شکار رہے تھے۔ وہ مسائلی مرد جو ہمیں کاغذی وباؤں میں گھول رہے تھے محض عورتوں کو نفیس نام، سرسبز شوق سے سونگھنے میں کئی برس گذار دیے۔ انھوں نے بالا ارادہ مہیب درندہ نگاہ سے مباشرت کی۔ اس طرح خاکستری پپوٹوں کی گمبھیر آنکھ بھی شدید تھیوریکس

درد میں غفلت مآب ٹھہری ہے........!

اب تمام شب ہمارے سروں پر مہیب مصیبت آسمان اپنا فاصلہ بسر ہونے تک کابوس کو باخبر کرے گا۔حالانکہ ہمارے میزبان پیٹ بھر چکے ہیں اور جو اس تماشہ میں بسر ہونے سے بچ گئے تھے۔وہ بے زبان،کثیف خواب کی دلدلوں میں زمانہ عبارت بن گئے ہیں۔اتنا ہی ذہن کی بے اعتنائی گفتگو کا بہانہ ہمارے آب وخاک کی رگوں پر خلط ملط لکھا ہوا ہے۔میں ہی کہوں گا کہ یہ ہمارا قصہ ہے۔

ابھی اتنا ہی کافی نہیں ہے۔

شب 2 مارچ: ایک آدمی (اوپر تابنے کا آکاش اور نیچے ریہرسل دھرتی) نفیس لا مرکزیت اظہار میں اپنے خاک دان میں صفر صفر گر رہا ہے۔وہ نتھنوں کے نیچے لتھڑے دہکتے ہونٹوں کی کپکپاہٹ میں غرق ہوتا ہے۔چند لمحوں کی بات ہے آدمی لہو محلول بنے گونج جاتا ہے۔کہیں وہ تو میں نہیں ہوں؟

لیکن ....دنیا کے خوف ناک خلیوں میں میرا کوئی بھی نہیں ہے۔میں تو وادئ رنگ و بو سے اس قدیم بنجر میں آیا ہوں.........میں بھی ان لوگوں میں سے ہوں جنھوں نے ذو معنی عدم تشدد کا جواز شہری زندگی کے ایوانوں میں رنگ دیا،انجام کار مضبوط راستوں پر سنگینیاں اگلتی اور تجلی کا ٹیلکم بکھرتا تھا (ہے)........ مگر۔

اس سے پہلے ایک تیرہ سنگ محبس میں کچھ جمع کی ہوئی روٹیاں تھیں....... تبھی شہروں کی سمت جاتی ہوئی دھوپ تیز ہوگئی تھی۔آج میرا امکان کہاں ہے؟ ممکن ہے دانتوں کی کچکچاہٹ بے کراں شش جہت میں مضمحل ہو جائے.............میں خود فریبی کی لاشیں کیسے چھوڑ دوں........ نہیں........ عظیم چھینٹا قریب ہے۔ ●●

نوٹ: افسانے کے سارے الفاظ احمد ہمیش، افتخار جالب اور بلراج کومل کی نظموں سے مستعار ہیں۔ (ا۔ب)

تقطیب

آج کا چراغاں رات کے ڈھلتے ثانیوں سے منسلک ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ جدو جہد کی صبح کل ہماری منتظر ہوگی لیکن اب تو جم غفیر اپنی اپنی تنہائی کے تقسیم ہونے کا معروف ترین تماشہ انتہا تک پہنچا کر، پھر سے اکیلا ہو رہا ہے۔

میں نے سوچا تھا کہ تم اس جشنِ چراغاں میں ضرور آؤ گی مگر یہ رات، رات ہی رہی۔ میدان میں ہوا کے جھکڑ چل پڑے۔ میری نظروں کی تمازت بجھتی گئی۔ تمھارے اور میرے بیچ یہ معلق قید خانہ کیسے اور کب آیا؟ کون سی جدو جہد ان سلاخوں کا مداوا کر سکے گی؟ آزادی اور........بس اب یہ بے موقع رومانیت سے اکتاہٹ سی ہوتی ہے۔

یہ رات اس بقعہ نور کی صورت حال ہے جب ہمارے گھروں پر سفیدی نمودار ہوئی تھی۔ وہ دور کہ جب ہمارے گھروں پر سیاہی مقدر کر دی گئی تھی تب کوئی سلاخ فضا سے یہاں

نہیں اترتی تھی اور چراغ کہیں گم تھے۔

میں نے تیتسو یں سلاخ کو اپنے اوپر محسوس کیا۔ مجھے یاد آیا۔ یہاں گھر کے اس کمرہ میں جہاں الکٹرک فین گھوم رہا ہے گھر کا سب سے بڑا بوڑھا، ارنڈی کے درخت کی شاخیں سلیقہ سے لٹکایا کرتا تھا۔ میرے اور دادا کے بیچ کی جدوجہد، اتنی وسیع تھی؟ میں فیصلہ نہیں کر پایا۔ ظاہر اور باطن خلط ملط ہو گئے ہیں۔ ہاں اپنے جسم پر میں بیسیوں زخم شمار کر چکا ہوں۔

یہ گھر کب تعمیر ہوا تھا اس کا علم ہم میں سے کسی کو نہ تھا۔ اپنی تسلی کے لیے ہم نے سوچا تھا کہ شاید کسی تاریخی گردش کا نتیجہ ہو۔ کوئی نہ کوئی شئے کائنات کی کسی نہ کسی گردش کا نتیجہ ہی تو ہے۔

تم، فلک کی کتنی گردشوں میں، خاک کے کس پردہ سے ابھری ہو۔

پھر میں ہی تو ہوں، جو اپنے اوپر سلاخوں کو برداشت کر رہا ہوں۔ یہ سلاخیں کسی چکراتے ہوئے ازلی جذبہ کا متعین وقفہ ہیں؟ ممکن ہے یہی میرا حاصل ہو!

کمرے کے دروازہ سے میں نے پھر سے پلٹ کر بندر کو دیکھا۔ بوڑھا بندر۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی یہ بوڑھا بندر بوڑھے گھر کی بوڑھی گھڑی پر لیٹا مزے کی نیند سو رہا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ہمارا گھر سفید ہو گیا تھا تو ہم سب شش و پنج میں پڑ گئے تھے۔ اچانک ہمارے گھر کی ڈھلانوں میں پھیلے ہوئے ہرے جنگلوں کی بو باس اوڑھے، یہ لال بوڑھا بندر ہمارے سفید گھر میں داخل ہوا تھا۔ ابا نے اطمینان کی سانس لی تھی۔

بندر ابا کے لیے ورثہ تھا اور میرے لیے گھٹن۔

ایک دن جب میں نیلگری کے درختوں کے پاس سے مایوس لوٹا تھا تو میں نے بندر کو ایک نئی حرکت کرتے دیکھ لیا، میں ششدر رہ گیا، جس گھڑی کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے سفید

دیوار میں ایستادہ کیا تھا اس کو اس بندر نے وہاں سے بڑی صفائی سے علاحدہ کرلیا اور خود اس پر بیٹھ گیا۔تب ہی گھڑی کا پنڈولم ساکت ہوا اور گھر میں دھوئیں کی کثیف بو پھیل گئی۔ میں نے چونک کر اپنے گھر کو دیکھا اس میں ہلکی سی پیلاہٹ پھیلتی جارہی تھی۔

''سچ کہتا ہوں، تمھارے گھر کا نیلا سکون، چاروں طرف پھیلے ہوئے پراسرار، گمبھیر نیلگری کے درخت، مجھے اپنے سفید گھر کی یکسانیت سے اڑا کر، ہرے بھرے خواب ناک جزیروں میں پہنچادیتے ہیں.......... تم اونگھ رہی ہو۔''

گھر کی ڈھلان میں پھیلے ہوئے ہرے جنگل، لال بندر کے غصہ اور چڑچڑاہٹ سے منفی علاقہ کہلانے لگے۔میں متفکر ہوا۔

آخر، ان سب نے مجھ سے سوال کیا۔آخر تم ہو کون؟

ہم سب مختلف نہ تھے لیکن پہلی بار میں نے بے جگری سے کہا۔آپ تمام سے ہٹ کر میرے لیے موت کا قید خانہ کھلا ہے لیکن پھر بھی میں اپنی زندگی کی آزادی کی رمق کو پانے کی جدوجہد میں بھٹکتا ہوا ایک فتح مند ضمیر ہوں۔

دوسرے دن ابا سفر پر نکلے تو لوٹے نہیں۔

اب بوڑھا لال بندر گھڑی سے پوری طرح چپک گیا تھا اور گمان ہوتا تھا کہ یہ کوئی دوسرا جانا پہچانا بندر ہے۔میں دن بہ دن پھیلتی ہوئی دھوپ سے مانوس ہوتا گیا۔آخر کار جب تمام لوگوں کا خون بہتے بہتے جم کر، گھر کی دہلیز میں ٹھوس شکل اختیار کر گیا تو میں نے اپنے ہاتھ سرخ کر لیے۔

گھنی اندھیری رات میں پلنگ پر سنہری عورت ہلکے ہلکے مسکرا رہی تھی۔میں نے بہ ہر حال سکون کا سانس لیا۔مجھے اطلاع ہو چکی تھی کہ نیلگری کے درختوں کے پاس کاغذ کی

فیکٹری کا افتتاح ہونے والا ہے۔

بوڑھا بندر بھی سنہری عورت سے والہانہ شفقت کرتا تھا۔ وہ روزانہ اس کے قریب بیٹھ جاتا اور بڑی نمرتا سے اس کے بالوں میں کچھ تلاش کرتا۔

سنہری عورت ہم سب کی جدوجہد کا مرکز تھی۔

کڑکتی بجلیوں کی ایک سیاہ رات، جب ہم سب سو رہے تھے ند ۔اپنی جگہ سے اُٹھا، اس نے سنہری عورت کو اس کی اصلی جگہ سے جدا کیا اور اپنی مقررہ نشست کے قریب لٹاتے ہوئے عورت کے کانوں میں لٹکے سبز بندوں کو بے دردی سے علاحدہ کیا اور انھیں ٹھنڈے فرش پر پھینک دیا۔ عورت کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو ٹھنڈے فرش پر گرتے رہے۔ بندر تلخ مسکراہٹ ابھارتا رہا۔

عورت کا بھنبھوڑا ہوا جسم اداس ہے۔ وہ اپنی بریزر اور پیٹی کوٹ اپنے تھکے ہوئے پیروں سے بار بار اٹھانے کی کوشش کر چکی ہے مگر اس کا لاغر جسم اور ٹوٹی ہوئی کمر اسے معذور کر چکے ہیں۔ وہ نفرت بھری نظر سوئے ہوئے بندر پر ڈالتی ہے۔ اسے یاد آتا ہے اس منحوس بندر نے اس کا ایک خواب چکنا چور کر دیا تھا۔

وہ کراہتی ہوئی اٹھی تو اپنے بالکل سامنے ہم شکل بچے کو دیکھ کر چونک گئی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ بچہ نے کہا: ''ماں تو اب بوڑھی کر دی گئی ہے۔ میں تیرے تحفظ کے لیے تیرے ہی اندر سے نکلا ہوں تاکہ اس لال بندر کو ختم کر سکوں......'' بچہ آگے بڑھتا ہے مگر اچانک ہی بڑی پھرتی کے ساتھ بندر اُچکتا ہوا بچے کو دبوچ کر نیلی دیوار میں گاڑ دیتا ہے۔ مجھے آج بھی اس بچے کی ہمک ان دیواروں میں سرسراتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

جب میں نے تینتیسویں سلاخ اپنے اندر اتار لی تو پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ میرا سر

چکرا رہا ہے۔تو کیا کوئی تبدیلی ممکن ہے........ ہلکی سی دھندلی صبح صحن میں اُتر رہی ہے۔

نہیں خوابوں نے مجھے ہمیشہ ملول کیا ہے۔

عورت نے روز کی طرح شرم سے پانی پانی ہوکر نظریں نیچی کرلیں اوراس کے کان بندر کی چپٹ چپٹ سے گھن آلود ہو گئے۔ وہ اس منظر کو بہت دنوں سے تصور میں دیکھ رہی تھی جو اس گھر کی نیلاہٹ، زرد علاقوں سے دور، لال بندر سے پرے، ابھر رہا تھا۔

وہ اپنے بچے کو کوئی لباس نہیں پہنائے گی۔

مگر لال بندر اچھل کر اس کے قریب آتا ہے۔ وہ تلملا جاتی ہے۔مگر اس کی عصمت دری کی کوشش میں بندر لمحہ بہ لمحہ پاگل ہوتا جا رہا ہے۔ پھر اسے تمام گھر سیاہی میں ڈوبتا دکھائی دیا........ باہر صبح کی روشنی میں منفی علاقوں پر پیلاہٹ گہری ہوتی گئی۔

''تم نے بھی اچھا ہی کیا جو اپنے ہاتھ سرخ رنگ سے رنگ لیے۔'' ●●

تقلّب

دیوار پر، چمکتے ہوئے مقسام سے منقش ٹین کے ڈبہ میں مقید الکٹرک بٹن سے متعلقہ صحن میں ایک متوقع حادثہ اپنی حدت کو چھو گیا۔ ویسے ٹین کے ڈبہ کا ڈھکن کھلا تھا اور الکٹرک بٹن آف۔ صحن میں خوردبینی کالے انگور کا گچھا نما پھل اگانے والا درخت بھی:

آخر کار چڑیل نے درخت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا چوں کہ ہم بھی باہمی لامذہبی نطفہ کی چاہ میں باولے ہوئے جا رہے تھے۔ ہرے رنگ کے جیکٹ کو زرد یلا وزی دھاگہ سے رفو کر لیا گیا.........

ہرا بھرا تھا، سب کچھ معمولاً درست...... مگر .... مگر یہ دن : ہواؤں کی شرارت پر، حسی اعضاء میں گرفتار سلسلہ کو بالیدہ کیا، اصل میں حادثہ کا موجب ٹھہرا، وہ پھل جو ہوا کی میت سے اپنا وجود دھوپ چھاؤں میں منعکس کر رہا ہے، دور سے ایک دیدہ دکھائی پڑتا

ہے۔ ہر ایک دیدہ میں پچاسوں پتلیاں اور ہر پتلی میں صحن اور اس سے منعطف جگہوں کا منظر، کسی غیر مرئی دوربین کے اثر سے قید ہوتا آ رہا ہے۔

صحن میں حرکت کی حاجت زیادہ تر تین تنفس ہی کو محسوس ہوتی ہے۔

Shock Proof گھڑی باندھا ہاتھ

Ear Ring سے مزین کان

Smoke Coated ہونٹ

ان تینوں کے باہمی تعلقات پر صحن کا فیصلہ صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اگر اتفاق سے کوئی ہاتھ کان کو چھو لے تو تقدس اور اسی عمل کا تصور کسی بھی ہونٹ کے لیے گناہ ہے۔

''نہیں مری جان! کوئی گرفتار سلسلہ ابدی نہیں۔ کیا تم نہیں جانتی ہو کہ محبت ایک بے فیض ازلی جرم ہے۔''

''تو پھر دراز کار یہ جہاں، ابدی ہے جانم''

باوجود اس فیصلہ کے تینوں کی جبلی بغاوت اپنے اپنے احساس سے عبارت ہوئی۔ سگریٹ کا گھڑی سے جل اٹھنا اور دھوئیں کو ایر رنگ میں تحلیل کرنے کی سعی میں تنہا نشین ہونا اور اس منظر کو تصور میں لائے ایر رنگ کا انگڑائی بھر:

تپتی ہوئی ریت پر رستے ہوئے پٹرول کو دیکھ کر اونٹ نے مستی سے انگڑائی لی اور ہرا پرچم ڈھلک گیا۔ اس کے قدم بچے کچھے نخلستان کی ہوس میں اٹھے مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پیٹرول منجمد ہو کر کلب بن چکا ہے۔ پوری لگن اور جستجو کے ساتھ وہ اندر داخل ہوا۔ اس کے پاؤں ایرانی قالین کی چبھن سے تلملانے لگے۔ شراب کے آخری گھونٹ میں اسے پٹرول کی اس حرام نعمت کا گمان گزرا لیکن مجذوب شکن حسن نے اس کے ہریالے فلسفے کو ابھرنے سے

پہلے ہی توبہ شکن دعوت دی۔ وہ اٹھا اور آئن سٹائنی سلسلہ وراثت کے لطیف نطفہ میں خود اپنے لیے دیوار گریہ ہو کر رہ گیا۔ نزع کے آخری لمحوں میں، کہیں بہت دور سے، کھجور کے درختوں میں ڈوبتی اذان کی آواز سنائی دی۔ وہاں، مسجد میں تنہا چپل ہی تھی اور کلب میں کلثومی لئے صلواۃ بن کر گونج رہی تھی۔

لینا۔ مگر گھڑی کو دیکھ تھمنا اور گھڑی کا ایئر رنگ کی مالیت پر غور کرنا اور سگریٹ کے نقصانات کا جائزہ لینا۔ گئی رات، ہوائیں لبوں سے ٹکرا ٹکرا کر طوفان بن گئیں، گو چاند میلا میلا تھا لیکن چہار جانب مد و جزر عروج پر تھا۔ صبح خنک آمیز اور شاید دنیا میں ہر طرف درختوں سے پھول پتیاں اور پھل گر چکے تھے۔ تب خود بینی پھل کی پتلی میں گرفتار سلسلہ کی ابتدائی تفصیل۔

انلارج منظر تھر تھرا رہا تھا۔

صحن میں آخری کنارے کے دروازے پر کان اور ہونٹ کے رضامند دن YES اور منحرف لمحے NO تحریری اشارے فرض کیے گئے۔ ایک دن ایک متشکی معاملہ میں NO OR YES تحریر کیا گیا تھا مگر برا ہو اس بارش کا کہ اس نے اپنے فطری ظلم سے اسے ORE کر دیا ہاتھ نے اس تحریر پر غور کیا تو سمجھا کہ ابھی گرفتار سلسلہ کچا ہی ہے۔ تب رم جھم بارش ہو رہی تھی۔ ہاتھ نے درخت کی شاخ پر اپنی شاک پروف گھڑی باندھ کر، کھڑکی کی اوٹ میں ہوئے متوقع ڈرامہ کے وقوعہ کا انتظار کرنے لگا۔ الکٹرک بٹن آف اور ٹین کے ڈبہ کا ڈھکن بند تھا۔ درخت کے پتوں پر پہلی سازش پھیل چکی تھی۔ کش لے کر ہونٹ نے کان کو آواز دی مگر وہ جھاگ دار آواز پیدا کرنے میں مصروف اس نے غصہ سے پانی بھرا رنجن الٹ دیا۔ کھڑکی کا پٹ مسکرایا۔ گھڑی جھومنے لگی، ایئر رنگ بے خبر.........

علاحدگی اور شک کے لفظ ابھی ابھی تولد ہوئے۔

آنکھ کی پتلی سورج کے گہن کو کھا کر خواب نما منظر دکھلاتی ہے۔

...... مری جان! میں نے دیکھا کہ لامحدود خلا میں کان ہونٹ اور ہاتھ تیر رہے ہیں۔اول اول اچانک ہی ہونٹ ان سے جدا ہوا اور اس خلائے بسیط میں جھیل کے دو کنارے ابھر آئے تب فضا میں لپکتا ہوا ہاتھ جھیل پر گرا اور تب ہی کٹا پھٹا ساحل نمودار ہوا۔آخری لمحوں میں کان نے ٹھیک ٹھیک اپنا آدھا جسم زمین اور پانی پر گرائے مینڈک کی شکل اختیار کر لی۔

جان، میں نے تم سے کہا تھا کہ ہر دائمی جذبہ (؟) اس تقلب زندگی:

''ہم تقلب میں زندگی گزارتے رہے اور اس دنیا کو فقط احمد آباد سمجھا اور احد کے میدان کو بھول گئے۔'' کی شکنجہ خیز آوازوں سے گھبرا کر، اپنے آپ سے فرار ہوتا ہے۔

آج صحن پختہ ہو چکا ہے اور درخت کی جگہ ایک بڑی ٹاور گھڑی ایستادہ ہے۔ٹین کے ڈبہ کا متبادل 1100 VOLTS بورڈ لٹک رہا ہے۔سنا ہے کسی نئے تمدن نے صحن میں کرایہ کر لیا ہے۔لیکن اس صحن سے منحرف جگہوں میں آج بھی درخت کہیں نہ کہیں سانس لیتا ہوگا۔گوا ہیئر رنگ نے الوداعی بوسوں سے دور اطمینان آسن کے مسکن میں خود کو چھپا لیا ہے.... اور سب چیزیں دفن ہو چکی ہیں پھر بھی گرفتار سلسلہ کی قبر:

ہاتھ کی ہتھیلی میں خارش کی جاگتی ہوس

کان میں ہونٹ کی آواز قریب سے سننے کی لگن

ہونٹ میں مانوس آواز کو چکھنے کی چاہت

ہوس، لگن اور چاہت عمل کی طرف بڑھے۔

ہاتھ نے چالیس روپے کپاس میں ڈال دیے۔کپاس کو کپڑا بننے میں کتنی دیر لگتی ہے جب کہ وہ ان امور میں طاق ہے۔نتیجے میں نوے روپے ہاتھ آئے اور خارش کا سلسلہ ختم ہوا۔

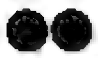
ایئر رنگ چکراتے چکراتے ٹھٹھک لیں اسے ایسا محسوس ہوا کہ صحن میں مخفی آوازیں اسے دبوچ نہ لیں۔تھوڑی دور، کرسی پر لاپرواہ دھواں، چوکور کھڑکی سے بل کھا کر نکل رہا تھا۔کچھ سوچ کر اس نے اپنے چکرانے کی روداد مٹیالے کاغذ پر منکشف کر دی اور پھر کرسی کے قریب غیر مسطح کاغذی کرہ گرا۔گھبراہٹ میں سگریٹ اسی غیر مسطح کرہ پر گرا۔اس سے پہلے کہ کیمیائی حادثہ لطافت کو ختم کر دیتا وہ چکرانے کی روداد سے واقف ہو گیا اور اٹھا اور صحن میں جھانکنے لگا۔کان کے انتہائی نچلے حصہ پر رگوں کا کھجور، اسے اتنا پیارا تھا کہ وہ یہی کہہ سکا۔''تم'' معطر حسن کا کیا نام ہو سکتا ہے۔مگر لگن کامران ہو گئی۔

سگریٹ پھینک کر وہ، پانی سے بھرے رنجن کے قریب ہو گیا۔اپنی طویل سانسوں پر قابو نہ پاتے ہوئے اس نے دیکھا کہ کان درخت کے تنے سے ٹکا ہے اور اس کی لویں سرخ ہو چلی ہیں۔باوجود کہ آج کان کا میلان دن، وہ چاہت کے شہاب ثاقبوں کو پکڑتا آگے بڑھتا گیا اور اپنے دھواں آلود ہونٹوں سے سرخی نگلتا رہا۔دیوار پر دیا نما۔

نیم تاریک تہہ خانہ میں منصوبہ کی آخری سطروں کو دیے کی سیاہی سے رقم کر، اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔وہ جگالی کیے سو چکا تھا۔اطمینان کا سانس لے کر اس نے اپنی دم ہلائی اور اپنا منہ عدم تشدد گاہ کی طرف موڑ دیا۔اس کی غصہ ور آنکھوں میں ہرے پرچم کی بے حرمتی کا ماتم کرتا انبوہ تھا۔اس کے جبڑے پھیل گئے اس کا سویا ہوا ساتھی اگر اسے اس روپ میں دیکھ لیتا تو شاید سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گاؤں گاؤں کھیت کھیت، ہل اٹھائے، اپنے فرضی باپ کو عملی خراج عقیدت پیش کرتا۔مگر.......اپنی دم میں دیا اٹھائے، اس نے اپنے سوئے ساتھی کو الوداعی طنز سے دیکھا اور دوڑتے ہوئے، عدم تشدد گاہ میں موجود ہرے رنگ پر لال چھینٹے برسانے کی تاریخ مرتب کر لی..........!

کھول کر آج بھی یہ منظر دیکھا جا سکتا ہے: ''قبر کے فرش سے متصل دیوار میں سگریٹ ٹھونکا ہوا ہے اور دھواں پھیل رہا ہے۔ دھوئیں کے باعث، ایئر رنگ سگریٹ کو اپنے ہالہ میں لیے چکرا رہی ہے اور اس عمل کو دیکھ کر فرش پر گھڑی، اچک اچک کر ان دونوں کو علاحدہ کرنے کی کوشش میں اپنا مشینی نظام درہم برہم۔

''جانم! سچ ہے، سبھی ابدیت میں مبتلا ہونے کا ڈھونگ کرتے رہے اور مر گئے۔''



اقلیما سے پرے ہُو

(پاشاہ کے نام)

.........جب منقلب سوئی کے تاریک دھاگے کا سرا ختم ہوا تو میں نے ایک کھلی ہوئی دوپہر میں خود کو یہاں پڑا پایا۔

تپتے ہوئے ذرات سے سارا جسم اٹ چکا تھا ادھ مری آنکھوں سے دور دور تک نظریں دوڑائیں مگر وہاں کیا تھا! ایک میں اور مجھ سے پرے ہو میں لپٹی ہوئی ساعتیں۔

پتہ نہیں جسم پر کتنی روئیں ایسی ہوں گی جو ایک ایک احساس کو چوکس شکاری کی طرح قید کر لیتی ہیں۔ ان قید خانوں میں تشنگی کی پتھرائی ہوئی آنکھ اور اقلیما کا عکس۔ ایک جاوداں تشنگی ہے اور ایک محصور دروازہ........ جو کبھی نہیں کھلتا۔

باہر کائنات کی ہولناک مسکراہٹ میں فنا کا گیت گونج رہا ہے۔ لیکن میرے عقب میں ان دیکھے قدموں کی کھڑکھڑاتی آوازیں، مجھے ہی ہنستے رہنا ہے۔ خواہ وہ سنیچر کو سمندر کے

قریب گڑھے کھودتے ہوئے پاؤں ہوں کہ مالِ غنیمت پر للچائی ہوئی آنکھ۔

علاحدگی تو صرف ایک سراب ہے۔ ورنہ۔ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ چاروں طرف پھیلا ہوا ریگستان، آخر مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔ اندر باہر چاروں طرف ریگستان۔

ابتدائے آفرینش سے اب تک جن جن درختوں نے مجھے بے برگ و بار کیا تھا ان میں سے کوئی بھی یہاں نظر نہیں آتا۔ جب اس شاخ سے مجھے پہلی بار کوچ کا مرحلہ نصیب ہوا تو وہ دونوں میرے ہم راہ دھوئیں کے رتھ پر سوار نیچے نیچے تتر بتر ہو گئے تھے۔ پھر بھی ہم یک جا ہوتے رہے، شکلیں بدل بدل کر۔

شاید وہ جمعہ کی خوں آشام سہ پہر تھی...... نیم کے درخت کے پاس آنکھیں میچے وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ اپنے کاندھے سے ہل پھینک کر، میں نے اس کے گلے پر نظر ڈالی وہاں خوش نما پھول پتیوں والا خوش نما رومال پھڑ پھڑا رہا تھا۔ وہ صاف ستھرے سیاہ لباس میں ملبوس ہدایت کردہ سمت میں منہ اٹھائے ہوئے دہرا رہا تھا

''جب آنکھوں سے روشنی چھین لی جائے گی اور سمندر کا پانی ہانپ اٹھے گا تو اے انِ و جنس تم کسے پکارو گے''۔

اس کے پیروں کے پاس مقدس قربانی رکھی ہوئی تھی اور پاس کی بہتی ندی میں اس کا سایہ لہروں سے کشمکش کر رہا تھا۔ ''چلو''، اس نے آنکھیں کھول دیں اور ایک لمحہ کے لیے میرے سینے میں تقریباً ویسا ہی خوف اتر آیا جب میں نے پہلی بار حلق میں ممنوعہ پھل اُتارا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کے دیدوں میں ہری گھاس سے بنی کھڑکی سے روشن اقلیما کا چہرہ تھرتھرا رہا ہے۔ وہ قربانی اٹھانے کے لیے جھکا اور فوراً مجھے دھکا دے کر خود بھی اچک گیا۔ سامنے کالا

سانپ لہراتا ہوا ندی کے بہاؤ میں گم ہوگیا۔ایک لمحہ کے لیے میں نے سوچا لالچ تو محض شکستہ خواہش ہے۔

پھر بھی ہم دونوں چلتے رہے اور مقرر کردہ آمنے سامنے کی چٹانوں پر اپنی اپنی قربانی رکھ دی۔اطراف پیپل کے درختوں پر اسرار اونگھ رہا تھا........ اچانک جھما کے کے ساتھ ایک تیز آندھی کا بگولہ وہاں داخل ہوا اور میں نے آنکھیں کھول کر مشتبہ انداز میں پہنان پر نظریں ڈال دیں۔مگر میری قربانی وہاں موجود تھی اور دوسری چٹان عریاں، اس لمحہ اس کی آنکھیں سرخ ہوتی گئیں، اور وہ اپنے طاؤس نما پاؤں اٹھائے میرے جانب بڑھنے لگا۔پھر اس نے اپنے سیاہ لباس سے کوئی چمک دار شئے نکالی اور میرے حلق سے اق ق ق لیما کا خرخراتا لفظ اس گھومتی ہوئی زمین میں چکرا گیا۔آسمان پر لال دریا پھیل گیا اور فنا کا گیت گونج اٹھا۔

شام تھی۔میں ویسٹ انڈیز اور انڈیا کی کرکٹ کمنٹری سے فارغ ہو کر صحن میں پہنچا تو شہتوت کے درخت کے قریب وہ آنکھیں یک ٹک مجھے گھور رہی تھیں۔تنفس سے نکلا۔ ''اقلیما'' اور میں شفق آسا وادی میں ڈوب گیا۔وہیں بیت الخلا سے متصل دیوار کے قریب ہم نے بدنام لفظ کی دیوار کو آخری اینٹ دے دی۔

تبھی عقبی گلی میں فائر بریگیڈ گونج اُٹھا۔

شفق آسا وادی سے جدا ہو کر جب میں چھت پر پہنچا تو وہاں آسمان پر آگ کی بجائے رات پھیل چکی تھی۔نیچے اترنے تک صحن میں سارے رابطے کٹ چکے تھے اور وہاں ایک گوریلا جاوا پر تھرک رہا تھا اس کے سر پر وضو کے بعد کا مرحلہ رسم ہونے کی کہانی بکھیر رہا تھا۔میں سب کچھ جان گیا.........

سامنے ایک دیوار لمحہ لمحہ اگتی گئی اور کوئی اندر کی آگ اور دھوئیں کو ہٹاتا ہوا مجھ سے

جدا ہوا۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھوں میں ایک کلہاڑا ہے۔ پہلے ہی وار پر دیوار کے پتھر جھر جھرا گئے اور وہ دیوانہ وار دیوار پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے پسینے میں سارے پتھر ڈوب چکے تھے اور اب وہ بنیاد اکھاڑ پھینکنے کی سعی میں ڈوب گیا۔ پہلے ہی وار پر ایک افعی نکلا، وہ اسے اپنے گلے میں لپیٹتے ہوئے دوسرے وار کے لیے سانسیں درست کرنے، مسلسل واروں کی زد میں مکڑیوں کے جال، چاقو، نمک اور ادھیڑے ہوئے پتے نکلتے گئے اور آخر کار تہہ میں اسے وہ کاغذات مل گئے جس کی اسے تلاش تھی۔ مگر یہ کیا؟؟!! کاغذات پر روشن بدنام لفظ خود اس کے پسینے سے بجھ گئے تھے اور صرف بے ربط دستخطیں اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ جوئے شیر کی عدم حصول یابی میں صبحوں اور شاموں کی تنہائی اب سخت جان ہے۔ افعی اسے ڈس رہا ہے۔ مگر وہ سرگشتہ خمارِ سوم وقیود بھی ہے یا نہیں پتہ نہیں۔ سامنے پھر دیوار اگ آتی ہے اور اس کی منڈیروں پر گوریلا اپنا جاو اتھر تھرا رہا ہے۔

''قناعت''، میرے منہ سے نکل گیا مگر قناعت کیسے آئے، اپنے اندر کے گرگٹ سے اتنا لڑنا ہوگا کہ بے ہاتھ ہو جاؤں ورنہ اس بے رحم چھلنی میں اپنا وجود ڈالے، قطرہ قطرہ ہونے کا منظر دیکھ پاؤں گا۔ اتنا شاید کبھی کافی نہ ہوگا کہ جہنم آسا زندگی کا لحاتی مداوا کسی اجنبی رات میں اپنی مانوس اداسی اور تنہا چاند میں ڈھونڈوں۔

چاند نکل آیا ہے اور ریگستان نا قابلِ تسخیر ہے..........

پیچھے، بادیہ کے سنگ میل کو بگولوں نے چاٹ لیا ہے وہاں سرخ نیزے ریت پر کیپٹل لفظ دائم کرنے میں سرگرداں ہیں۔ اب ان دیکھے قدموں کی بازگشت عادت سی بن گئی ہے۔ چلتے رہنے کے سوا اور کیا ہی کیا جا سکتا ہے۔

ایک اکیلا منتشر انبواہ اور اس قدر کٹی پھٹی زمین...... ہریالے فلسفہ کہاں اگتے

ہیں۔معدومی اور بے راہ روی، کتنے راستے اس بیچ درمیان میں آ گرے مگر........ مگر دور شاید ایک چوکور کنواں ہے۔ میں تھکا ماندہ بے فیض وہاں پہنچتا ہوں مگر وہ وہاں بھی چوکور دیوار سے متصل سیاہ دعمامے ذلیل وخوار پڑے ہیں۔''یہ حب حزن تو نہیں؟ میں نے جواب دیا تھا تیس سال کی عظیم محنت کے بعد جن چھ جلدوں سے ہماری فہم روشن کی اس پر اندھیرا نہیں پھینکا جانا چاہئے۔مگر سیاہ عمامے اندھرا پھینکتے رہے اور کبھی تو عذاب کی توجیہہ کے لیے ایک نسل کا ذہن کافی نہیں ہوتا..........

وہ منگل کی ایک اکتاہٹ بھری رات تھی۔

مدراس کیفے میں پاکستان ریڈیو سن کر جب میں مین روڈ پر نکل آیا تو زندگی رواں دواں تھی۔سامنے کی عمارت کی بالکنی پر نظر دوڑائی تو کینسر کا شرطیہ علاج، بورڈ دکھائی دیا، لمس آمیز گلیوں سے گزر کرتا ہوا قبرستان پہنچا تو وہاں ببول کے درخت کے نیچے ایک اونٹ تھکا ماندہ بیٹھا تھا........ مجھے ریڈیو کی خبریں یاد آ ئیں اور دل ہی دل میں ملی ترانہ گنگناتا ہوا آگے بڑھا ہی تھا کہ جانے کہاں سے ایک پتھر پاؤں کے قریب آ گرا۔اور پھر چیخ پکار اور نعروں کی گونج میں میرے بدحواس معطل پاؤں ممنوعہ دروازہ میں داخل ہوئے۔ایک جاوداں تشنگی ہے اور ایک محصور دروازہ.......... جو کبھی نہیں کھلتا۔اب جو بھی ہو کیا کیا جا سکتا ہے۔پناہ وجود سے الگ کوئی چیز نہیں۔اندر داخل ہوا تو صحن میں چاندنی سمٹی ہوئی تھی.......... یہ یقین ہو گیا کہ یہاں فساد میں ہی ممنوعہ چہروں کا دیدار ہوتا ہے چھت پر پہنچا تو گئی رات تک فائر بریگیڈ انجنوں کی نیند ابھی ٹوٹی نہیں تھی۔صحن میں شہتوت کا درخت کاٹ دیا گیا تھا۔

آگ چاروں طرف۔اندر باہر راکھ اور ملبوں کے ڈھیر۔

بات عمامے پر رنگ کی بارش سے شروع ہوئی۔

''اقلیما''........ چاند کو تکتے تکتے مجھے ہوش نہیں رہا اور میں نے دیکھا۔ میری زبان کی نوک ایک وسیع گنبد کے بہاؤ پر ٹکی ہے اور میرا سارا وجود معلق۔ گنبد کے محدبی بہاؤ پر سفر کرتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے میں نے دیکھا کہ نیچے، ایک عجیب الخلقت عفریت ناچ رہا ہے۔ اس کے تلوے ٹینک نما اور ٹانگیں میزائیل آسا اور ان کے درمیان ایک ننگ دھڑنگ عورت لٹک رہی ہے۔ سر پر سواستک نما پھریرے لہرا رہے ہیں اور دھڑ ایک کٹی پھٹی زمین کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ ہاتھوں کے بجائے ایریل پول کندھوں سے جڑے ہیں۔ میرے سفر کے اختتام کی چیخ، اس کے حلق میں اتر آئی ہے، اور میں بڑبڑا گیا، کنویں میں ابھی تک میری چیخ گونج رہی تھی۔ سیاہ عمامے اسی طرح ذلیل وخوار تھے۔ دن نکل آیا تھا میں نے سوچا اگر ہم کسی علامتی شبیہ سے ہراساں تیز گام ہیں تو وقت اور زماں ہمارے لیے کیا رہ جائیں گے۔ عذاب کی توجیہہ کے لیے ایک نسل کا ذہن کافی ہے؟!

اس ریگستان میں پتہ نہیں کب سے بارش روک دی گئی ہے۔ اب تو میں اس ریگستان میں آجانے کی وجہ سے ماورا ہو چکا ہوں۔ پتہ نہیں مجھے کس کی تلاش ہے۔ ایک جاوداں تشنگی ہے اور ایک محصور دروازہ، جو کبھی نہیں کھلتا، مگر یہیں سے گذرتے رہنا ہوگا۔ شاید انسان کی ابتداء بھی خدا کے ظہور کی طرح ایک واقعہ ہے مگر آدمی خدا کہاں ہے؟ صرف بے ربط دستخطیں ہیں مگر سیاہ ورق کی لمبائی کا اندازہ کون کرے........

اقلیما کا عکس اور قید خانوں میں فنا کا گیت۔ اس قضیہ میں مجھے وہ تڑکا اچھی طرح یاد ہے۔ شروع میں اس کی طوالت کا اندازہ مجھے بھی نہیں تھا۔ روشن دان سے منعکس ہوتی ہوئی کرنوں کے احساس پر معلوم ہوا کہ روشن دان سے اس کی جڑیں میرے بستر کی جانب آرہی ہیں۔ دیوار پر ٹنگی آیتیں ہمیشہ کی طرح مجھ سے بیزار تھیں جب وہ پوری طرح میری آنکھوں اور

پھر بستر میں پیوست ہوگئیں تو اس عمل کے اختتام پر مجھے احساس ہوا کہ گاجر کا پودا مجھ پر چھا چکا ہے اور میرے ناتولد قطروں سے پرے رات حوض پر اتر آئی تو دروازہ کے قریب مجھے احساس ہوا کہ کیا ان رابطوں کا حاصل بس ایک چھلچھلا حقیر عمل ہے جہاں اقلیما محض چند آیتوں کے اعلان میں ممنوع ہے......... اذان کی آواز پر جب میں دروازہ کے روزنوں سے جھانکتا ہوں تو ہمیشہ کی طرح وہ سب اس سردترین دھواں آمیز صبح میں اپنی اپنی پیشانیاں دھونے میں خشوع وخضوع محسوس کرتے۔ انھیں شاید علم نہیں تھا کہ مسجد کے اس کمرہ میں ایک میلا بستر ہولناک درخت کی زد میں محو استراحت ہے۔ فلاح کے راستے بلانے والی آواز نیند میں تحلیل ہوگئی ہے اور پشیمانی کسی مفہوم میں عبادت معلوم نہیں ہوتی۔ علاحدگی تو صرف سراب ہے ورنہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد نہیں اول اول کون سی جگہ گندی ہوئی کیوں کہ ہوش آنے تلک تو معلوم ہی نہ تھا کہ لال مٹی کے آگے بھی کنویں، انسان، بازار، تالاب اور پتنگ آباد ہیں۔ غالباً وہ کوئی دوپہر یا پتنگ اڑانے والی شام تھی کہ دھاگہ تن چکا تھا۔ نہ کوئی معبود نہ ہی کوئی عابد، بس ایک انبساط تھا جو یہ محرک خزینے کسی حبس زدہ دھوپیلے گوشے، تھیٹر کی اندھیری سیٹ، قبر کا چبوترہ، باولیوں کی کمان یا فصیل پر رکھی توپ پر واہوتے تب رٹی رٹائی آیت کا نام بھی مجھے معلوم نہ تھا۔

بس وہ نسائی آنکھیں یاد ہیں۔

انھیں آنکھوں کو مسرت پہنچانے کے لیے دو پاؤں بے چین رہتے۔ وہیں کہیں ایک درگاہ تھی اور کہیں کوئی پارہ پڑھنے کا منتظر رہتا۔ تب تپتی ہوئی دوپہر میں دو پاؤں درگاہ پہنچتے اور شام سر پر آجاتی۔ مولسری کی آخری شاخ پر دور کے قبرستان سے رات کے آثار پر جلد جلد اپنی

جیبیں بھرے، بھاگتے، دو پاؤں دہلیز تک پہنچتے۔مولسریوں کی منتظر آنکھیں۔اور میں۔اور بس۔ایسے ہی کبھی کبھی جی چاہتا کہ اس کی مرتعش دونوں مولسریوں کو اس سے طلب کرلوں مگر جمعرات کا دن آموختہ کا ہوتا۔

لیکن متحرک خزینے کی دریافت میں کالی مٹی ہی سب کچھ ہے کیوں کہ اقلیما اور شہتوت کا درخت یہیں نمو پاتے رہے اور میں دیوار کے ساتھ ملبے میں اپنے آپ کو ڈھونڈ تا رہا۔

منتخب تاریخ کا علم مجھے گھر ہی کے ایک فرد سے ہوا۔ابھی ابھی سویرا ہوا تھا مگر چہرے پر یک دم کئی سورج گر پڑے۔گرمی میں، دوپہر، سات گنبد کے قبرستان، کیفے کے گوشہ اور مسجد کے متعفن بستر پر بیت گئی۔ایک میں تھا اور مجھ سے پرے ہُو میں لپٹی ہوئی ساعتیں۔ایک طویل چپ کا مفہوم یہی نہیں تھا کہ پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی بلکہ...... تب سے میرے پاؤں سڈوپوڈیا Pseudopodia ہو چکے ہیں۔اس بیچ کے عرصہ کی تبدیلی میں ایک نامعلوم کتھئی کاغذ شہتوت کے پتے نمک اور مکڑیوں کے جال سے کس خوف میں مبتلا ہوں اندازہ نہیں ہوتا۔ہاں اس رات رم جھم تھی۔

مخصوص پاؤں کی دھمک پر آنکھ کھل گئی میں نے ٹین کے نچلے خلا سے دیکھا تو مخصوص چاکلیٹی رنگ نظر آیا۔حالاں کہ چاندنی اس رم جھم میں بھی صاف اور شفاف تھی۔رم جھم تھی کہ جسم میں اترتی چلی گئی۔گندگی بہا دینے کی حاجت تو محض حرکت کرنے کا ایک جواز تھی۔ سرہانے، دائیں طرف، برف افسانہ کا دوسرا ورق اُلٹا ہوا تھا۔میں اُٹھا واپس ہوتے ہوئے احساس تھا کہ سب کچھ ناکام ہی رہا۔کسی نئی آیت کو پڑھنے کی ضرورت عف عف کی بوکھلاہٹ میں ناکام رہی۔لیکن شفق آسا وادی اور کہسار، مچھلیوں کے آئینہ مجھے ٹکڑے ٹکڑے ہونے پر

مجبور کر چکے تھے۔ جب ٹین کے پترے سے کٹ کر صبح میرے چہرے پر گری تو رضائی میں چھپی میری آنکھیں صحن میں موجود ایک طویل سناٹے سے سراسیمہ .... ''اٹھو''، رضائی کے اُلٹتے ہی ایک طمانچہ کا احساس ہوا اور اخلاقیات کے ورق اُلٹتے رہے۔ گویا عف عف کا اظہار غلط نہیں تھا۔ میں ایک نامعلوم گُتّی کے خوف میں مبتلا ہوں؟

کتابیں پھینک کر میں گھر سے بس اسٹانڈ کی طرف دوڑا.... ' یہ تک راستہ چلتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ چلتی ہوئی بس میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ سامنے پولیس اسٹیشن ویران، لال مٹی کا وطن خموش........ پائیدان سے نیچے پاؤں رکھتے ہی سطح زمین پر ایک قبر طلسم انگیز طور پر ابھری، اگلا پاؤں نکلنے سے قبل پھر ایک قبر کا اضافہ، میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی، گاؤں میں اداس مجرم شام کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ قبروں کی درمیانی جگہ پر سے میرے پاؤں گھر تک کا فاصلہ طے کرتے رہے۔ گھر کی چوکھٹ پر بھی ایک قبر موجود تھی۔ پھر اندر داخل ہوا تو صحن، باورچی خانہ، بیت الخلاء، پرانا حجرہ سبھی قبروں کے مسکن تھے۔ گھر میں کوئی نہیں تھا تو کیا عف عف کا وقوعہ......... ؟ چھت پر بھی قبریں موجود تھیں۔ منڈیروں پر ٹھہر کر میں نے دور تک نظر دوڑائی، مگر آدمی کوئی نہیں تھا۔ قبریں ہی قبریں۔ آسمان پر لال بھبوکا سورج دور مولسری کے درخت پر گر پڑا تھا۔

میں نے سوچا ممکن ہے وہ سب رات کے ٹیلے سے برآمد ہوں اور جو کچھ اپنے اندر طمانیت کی روشنی بچی ہے وہ بجھ جائے گی اور پھر........... دور دور تک الکٹرک پول اور پل کے نیچے ندی........ میں کب یہاں سے جدا ہوا تھا؟

دونسائی آنکھیں یاد ہیں حادثے زوال آمادہ نہیں اور فنا کا گیت گونجتا ہے کہ تخلیق میں مصروف ہے؟ پتہ نہیں۔

کاش میں ہمیشہ کی طرح یہاں مولسریاں توڑتا رہتا مگر کتابوں نے میرا جسم چاٹ لیا ہے۔اب یہاں ایک وحشت ناک ہو ہے اور میں بھاگ رہا ہوں۔واپسی میں کالی مٹی کی خلق کردہ آگ ٹھنڈی ہوجائے گی؟........زندگی اس قدر اجنبی ہوجائے گی کہ منقطع دستخطوں میں اپنا مفہوم ڈھونڈے گی۔یہ میں نے کب سوچا تھا قبریں میرے تعاقب میں ہیں اور میں بھاگ رہا ہوں۔اسی تنگ ودو میں گڈھے میں گر پڑا ہوں اور اوپر چار سفید پوش کچھ پڑھتے ہوئے مجھ پر کنکریاں پھینک رہے ہیں۔میں گھبرا کر پیچھے ہٹتا ہوں اور میرے قدم ریگستان میں دھنس جاتے ہیں۔

سورج نصف النہار پر ہے۔دور ایک درخت نظر آرہا ہے۔شام تک شاید نہ پہنچ جاؤں،تو کیا پیروں کے نیچے پڑا ریگستان ہی واحد حقیقت ہے اور اقلیما؟؟!!

چلتے رہنے کے علاوہ اور کچھ کیا ہی نہیں جا سکتا۔

آسمان پر لالی چھاتے ہی مجھے اس درخت کے سواستک نما پتے نظر آئے۔مگر یہ کیا؟........''یہ شجر زقوم تو نہیں؟''پھل انسانی سر کیسے ہوسکتے ہیں!!درخت کے نیچے بہتی ندی سے میرا سایہ کوئی کشمکش نہیں کرتا،ایک سحر ہے کہ جس کی زد میں اڑتا ہوا تنے میں سمایا جارہا ہوں۔ایک ان جانی وحشت میں پیچھے اچھلتا ہوں تو پلنگ کی ریلنگ سے ٹکراتا ہوں۔ریڈیو پر کسی معاہدہ پر دستخط ہونے کی خبر نشر ہورہی ہے اور سامنے بھائی اسٹیٹکس کے اعداد وشمار میں گم،رفع حاجت کے لیے اٹھتا ہوں مگر صحن میں کھڑا نیم کا درخت میرے قدم روکتا ہے۔تنے سے سر ٹکائے آنکھیں میچے،ہدایت کردہ سمت میں منہ اُٹھائے،دہراتا ہوں۔

''جب آنکھوں کی روشنی اچک لی جائے اور........ ●●

ادھورا پہیہ

.........یہ جگہ باعث یاد ہے۔

پتہ نہیں ہماہمی میں کتنا عرصہ بیت گیا۔کل جو بچی تھی،آج زندگی کے تسلسل میں معاون ہوچکی ہے۔

پہلے کی بات ہے کہ میں برسات کی چاندنی،سرما کے دھوئیں اور گرما کی دھول میں آوارہ ہوتا تھا۔مگر اب تو پہیہ مکمل کرنے کی دھن ہے۔لیکن پہیہ کی لکڑی کو جانے کہاں کی دیمک چاٹ گئی.........!

''ہم سب متفکر ہیں۔''

ایسے میں اس جگہ وہ ہنسی یاد آجاتی ہے۔

اس جگہ سے ملحق میری دکان ہے اور پچھواڑے مکان۔اسی جگہ وہ رہتی تھی۔اب

یہاں پبلک پیشاب خانہ ہے۔ ہمارا گاؤں وسیع ہو چکا ہے۔

وہ لوگ کھدر بنایا کرتے تھے۔ بھائی کا ارادہ تھا کہ بہن کسی سرکاری ملازم سے بیاہی جائے۔ ان دنوں میں آوارہ تھا۔ میرے والدلڑکی کو اپنی بہو بنانا چاہتے تھے مگر دادی اپنے ہی خاندان میں میری شادی کرنے پر بہ ضد ہوگئی اور میں اس کی ہنسی سے حیران تھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی گول گول آنکھیں گھما گھما کر ہنستی۔ اس روز برسات میں گھر کے قریب مبہوت ہوا۔ وہ اپنی سہ رنگی پٹیوں والی کھڑکی کے عین وسط میں بنے جھروکے سے اپنی گول آنکھ ٹکائے ہوئے تھی...... پہیہ!

ہماری اپنی بازیافت اور تکمیل کے لیے مجھے پہیہ مکمل کرنا ہی ہوگا تاکہ اسے ہم صحیح صحیح سہ رنگی سطح عین وسط معلق کرسکیں گے مگر یہ دیمک.........

ہماہمی میں کتنا وقت نکل گیا........

اس کی منگنی کے دن میں شہر بھاگ آیا۔ کالج چھوٹا۔ یہاں پہنچ کر میں نے کام سیکھا مجھے لکڑی تراشتا دیکھ شاعر دوست کہتا تم علاحدہ ہو کہ بازار سے مختلف ڈیزائن خلق کرتے ہو..... پتہ نہیں اب وہ کہاں ہے۔ شاعر........ سنا کہ اس نے آنکھیں کھو دی ہیں۔ شہر میں روزگار تھا مگر صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ دھواں، آوازیں، فیشن، وطن واپس لوٹا تو اس کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ اب بھی معمولاً ہنسا کرتی۔ شاید اس کی ہنسی سب کے لیے تھی۔ یا شاید فطرت۔ میں نے دکان کھول لی۔

اس روز گاؤں میں فساد ہوا۔ اس کا شوہر جوشیلا تھا۔ بے جگری سے لڑا اور مر گیا۔ یہیں اسی جگہ اس کا خون بہا تھا جہاں میونسپلٹی نے پبلک پیشاب خانہ بنوایا ہے۔

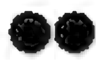
فسادات کے آگے پیچھے وہ کہیں گم ہوگئی۔ میں اسے دیکھ ہی نہیں پایا، حالاں کہ وہ

یہیں کہیں تھی۔ پھر مجھے اس دو پہر سکتہ سا ہوا تھا۔ وہ لڑکی جس کی آنکھیں بڑی بڑی گول گول تھیں جو ہمیشہ ہنستی تھی....... یہ وہ نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں، سکڑی سکڑی، پتلی پتلی ہو چکی تھیں........ پہیہ کے اندر کا دائرہ..........

سرما کی ابتدائی صبح جب میں پہیہ کی آوٹ لائن ڈالے گھر پہنچا تو پڑوس میں ویرانی تھی۔ وہ اور اس کے نگران اپنا تمام اثاثہ چھوڑ کر کہیں چل دیے تھے۔

آج بھی وہ ہر جگہ مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی گول گول آنکھیں لحہ بہ لحہ چھوٹی چھوٹی ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ جب یہ احساس اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو میں اپنی دیوانگی اور فن کاری، اس دیمک زدہ لکڑی پر صرف کرتا ہوں کہ کسی طرح پہیہ مکمل ہو جائے اور ہم اسے سہ رنگی سطح پر مکمل کیے اپنی بازیافت اور تکمیل کو دیکھ سکیں مگر......... مگر اندر کا چھوٹا دائرہ باہر کے وسیع دائرے سے دیمک کے باعث جڑ نہیں پاتا۔

یہ جگہ باعثِ یاد ہے.........



آبگینہ

تہجد کے آخری لمحوں میں وہ جاگ گیا۔

باہر کا پہلا شور نل کی آواز میں ابھرا۔ کھڑکی سے لمحہ کے لیے لاری دندنا گئی۔ کمرے میں اندھیرا اور سناٹا جوں کا توں تھا۔ تب ابتدائی لمحوں ہی میں وہ جاگ گیا ہوتا تھا...... جب چاند کی بے حس سطح پر کوئی جاندار پاؤں ٹکا، تھا اسی لمحے، وہ، اسے ساکت اور منجمد کر کے کہیں چل دی تھی۔ اب اس کی تمام زندگی سوٹ کیس میں بند تھی۔ پتہ نہیں کتنے زمانوں کی نیند وہ سوتا رہا۔

اس نے ٹٹولتے ہاتھوں سے آئینہ اور شیونگ بلیڈ تلاش کر لی تھی۔ شیو کا عمل جاری تھا۔ آئینہ کی نچلی محدب کنار سے خود بینی تصویر جھلملائی...... شہر کے میناروں سے اذانوں کی آوازیں گونجتی رہیں۔ اس کے منہ سے آہ تک نکل نہ سکی، گال سے خون بہہ نکلا۔ تب بھی سحر کا وقت ہی تھا، جب وہ کہیں چل دی تھی اور وہ ساکت اور منجمد ہو گیا تھا...... یہ تمام عرصہ جاگتا

ہوا لگتا ہے۔

اب اس کے خون میں قبر کا سناٹا موجزن ہے۔

صفر درجہ کے گمان پر اس کے پاؤں لمحہ کے لیے مکان کی دوسری سیڑھی پر رک گئے۔ نیم دھندلکا اس کے اطراف سے ہوتا ہوا، وادی میں اور گہرا ہو گیا تھا۔ پہلی ہی بار محسوس ہوا تھا کہ ہمیشہ کی طرح باہر ایک تحیر خیز روشنی ساتھ ساتھ رہے گی۔ سو اس کے پاؤں اٹھ ہی گئے۔ پتہ نہیں کتنی ہی بار ایسا ہوا تھا۔

اس طوفانی کہر آلود صبح سے بے نیاز ایک کسان، ہل کی گئی زمین میں بیج ڈالنے میں مگن تھا۔ اس کے پیچھے شہر کا بڑا پاور ہاؤز کہر میں جھلملا رہا تھا۔ اس کے پاؤں شہر کی سمت اٹھے اب کسان کو گمان ہو چکا تھا۔ پتہ نہیں یہ مسافت کتنی ہے۔

اس روندی ہوئی ٹھنڈی سڑک پر سفر ہوتا رہا۔ لاریاں اپنا اپنا مال دنیا کے ہر حصہ میں بانٹتے ہوئے تیزی سے بھاگ رہی تھیں.......... پتہ نہیں اور کہاں کہاں.........

ظہر کا وقت نکل گیا تھا۔ اخباروں کا پردہ ہٹا کر، وہ کمرے میں داخل ہوا۔ آئینہ کو دراز میں رکھ دیا، کرسی اور میز کھوکھلی ہو چلی تھیں۔ کتابوں کو بھی دیمک چاٹ رہی تھی.......... اور جانی پہچانی تصویروں سے آئیل پینٹ اُتر رہا تھا۔ دفعتاً وہ بے چین ہو اٹھا تھا کہ اس نے باہر کا بورڈ دیکھ لیا تھا لیکن کھلی دراز میں اپنی تصویر کو دیکھ وہیں چپکا بیٹھا رہا اور پھر چونک اٹھا۔ باہر نیم پلیٹ کے گرنے کی آواز آئی۔ گمان میں چلتے ہوئے لوگوں کی ہنسی کی آواز ابھری۔ پتہ نہیں یہ دیمک کب لگ گئی تھی۔

افطار صفر کی رفتار سے کھجوروں میں سموئی جا رہی تھی۔ وہ اپنے مکان سے یوں ہی نکل پڑا۔ راستہ پھولوں کے انبار سے اٹ گیا تھا، معلوم نہیں کس درخت کے یہ بے مصرف

پھول تھے۔سامنے الکٹرک پول سے بیل چمٹی ہوئی تھی۔گلی کے سنگ سیلوفرش پر یہ بیل کیسے اُگ آئی؟ شاید فرش کے نیچے زمین ہوگی ہی!!اسے دور تک اپنا کوئی قدیم دوست نظرنہیں آیا......... سامنے آتا ہوا بوڑھا، آنکھ اور کان نہیں رکھتا۔ پتہ نہیں اس بات کا احساس اسے کچھ پوچھنے سے کیوں روک دیتا ہے۔

ہوسکتا ہے اس کے لوٹنے تک یہ بیل بھی سوکھ جائے!

سائرن نے چاروں حواس معطل کر دیے۔صرف ہمیشہ کی طرح لذت باقی تھی..... میناروں سے کبوتر اُڑ چکے تھے۔وہ بھی بہرحال افطار میں شامل ہوا۔ بہت سے لوگ چاند کے گمان کو چاند سمجھ بیٹھے۔اس نے خشوع وخضوع سے نماز پڑھنا چاہی مگر نماز پڑھ لی۔ کسے پتہ تھا کہ اس کا جسم سائرن کی آواز سے زیادہ آنکھیں رکھتا ہے۔

رات آگ کی تلاش میں بھاگنے لگی۔اس نے تمام سیڑھیاں پار کرلیں۔ بلب روشن کر کے اس نے آئینہ اٹھایا، اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ کم از کم آج کے دن اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

تہجد کے آخری لمحوں میں بھی وہ جاگ نہیں پایا۔ ●●

اندیشہ

.......یہ مکان باعث اندیشہ ہے۔

مناسب اندھیرا ہو گیا ہے.......پھر بھی.........اب کہاں جایا جا سکتا ہے۔ ایک مبہم سی امید کہ وہ موجود نہ ہوگا۔

خوف کی دیوار مسلسل کون چڑھے.......عرصہ ہوا، ایسا سب کچھ ٹھیک لگتا تھا مگر اب پھسلنا.......اور پھر پستی۔ کچھ ٹھیک نہیں لگتا۔ پتہ نہیں نیچے کیا ہو۔

صبح سے ہی تھرتھراہٹ تھی۔ پہلے.......پہلے مگر دیوانگی.......پتہ نہیں اکتاہٹ کا یہ عرصہ کیسے بیت گیا.......! عادت بھی تو زندگی کا ایک سلیقہ ہے مگر اتنے دنوں بعد صبح صبح ہی اس کی آمد نے تھرتھراہٹ پیدا کر دی تھی اور پھر خوف کی دیوار۔

زندگی کی یکسانیت نے چڑھنا بھلا دیا ہے۔

دوپہر: گارڈن میں محاسبہ نے ایک تمثیل سمجھائی۔ دنیا میں پتہ نہیں کتنے پھول ہیں۔ چنبیلی، گلاب، گل مہر، کنول، گل اکبر.......... خوش بو یاد ہی تو ہے۔ ہواؤں میں مگر یہ کہاں۔ خوف، محاسبہ، اور جابر ہوا، ان کی آلۂ کار ہے۔ خوش بو مگر سیاہ سفید جیبوں میں بند۔

قبضہ گیری کا سورج کبھی اوجھل ہوا ہے؟

ہوا یہ کہ رات ابھی زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ خنک پر اسرار ماحول، دہلیز کے قریب میرے پاؤں ایک لمحہ کے لیے رکے۔ اندر یا باہر، تذبذب طاری ہوا۔ مگر اندر تو جانا ہی تھا۔ اندیشہ یہ تھا کہ وہ اب تک بھی موجود ہوگا۔ خوف یہ تھا کہ بہت سی یادیں روکی نہیں جا سکتیں۔

صبح ہی صبح اطلاع ملی تھی کہ وہ آ چکی ہے۔ عرصہ بعد گاوں کو شہر یاد آیا۔ یوں محبت بھی ایک مقید عرصہ ہے مگر یہ لمحاتی ہونا نہیں چاہتا اور یہیں سے ساری داستانیں پیچیدہ ہو جاتی ہیں۔ اب پتہ نہیں اتنے دنوں میں دنیا میں کتنے سیلاب آئے اور تھم گئے۔ اور کیا کیا ہوا۔ مگر میری دیوانگی اسی لیے تو میں نے عادت کو زندگی کا سلیقہ بنا لیا تھا۔ عادت میں محاسبہ کی گنجائش کہاں؟ مگر صبح کی تھرتھراہٹ نے کیسی اتھل پتھل مچا دی تھی۔

مکان کے اندر دبے پاؤں داخل ہوا۔ سناٹا۔ شاید وہ دوسرے کنارے سب کے ساتھ تھا۔ اس کنارے پر، ادھر، میرا مطالعہ کائنات میں لٹا بسا کمرہ......... اندر داخل ہوا تو ایک دوسرا خوف، آنکھ ملانا مشکل، خواہ مخواہ تم.........

کیا ہوا؟ دودھ ہیٹر پر رکھے ہوئے اس نے میرے چہرہ کو غور سے دیکھا۔

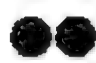
''اونہہ....... صبح سے کہاں تھے آپ؟''

ایسے ہی کچھ......... بچی سو گئی؟

ہاں......... مگر وہ.........وہ کافی انتظار کر کے چلی گئی۔

جواب کیا دیتا۔اطمینان کی لہروں میں بچی کے پاس پہنچا۔خوف کی دیوار ڈھ گئی تھی۔دیر تک نیند میں ہی اسے پیار کرتا رہا۔اچانک نیند میں، بچی بڑبڑانے لگی،''بندر''..... مڑکر میں نے اس سے کہا،آئندہ اسے جانوروں کے تماشہ سے دور رکھو۔کمرہ میں اُبلے ہوئے دودھ کا سنگیت گونج اُٹھا۔

یہ مکان باعثِ اندشیہ ہے.........



کوچ

.... یہ سفر باعثِ خوف ہے۔

بجی بجھی، معدوم ہوتی روشنی سے اب بھی بلی کا قہقہہ گھپ خاموشی میں کرسی سے ہو کر، یہاں قبرستان تک بڑھتا چلا آ رہا ہے۔

ہمیں نے اپنی اپنی کرسیاں یکے بعد دیگر چھوڑ دیں۔ اور اب ایک کرسی جو وہاں دور رکھی ہوئی ہے۔ سب کی میراث کہلاتی ہے۔

سامنے، ذرا سا دور، میدان ہونے کی کہانی ہے........ اور اس کے آگے یقینی صبح، جہاں ہم کو پہنچنا ہے تب ہی ہم نے طے کر لیا تھا کہ اس سفر کے لیے قبرستان کا راستہ زیادہ مفید ہے کہ دوسرے راستوں پر ہماری زندگی کی پہچان سہل ہو جایا کرتی تھی........

جن جسموں کے لیے یادکا روگ جذباتی تھا، وہ سب یکا یک قبروں سے چمٹ کر

رونے لگے۔اگر چہ انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ جن قبروں سے وہ چمٹے ہوئے ہیں وہ قبریں واقعی ان ہی کے رشتہ داروں کی ہیں؟!اس کے جواب میں ان سب نے ایک ہمہ گیر رشتہ کی یاد دلائی تو ہم آگے بڑھ گئے۔

اب بھی ان سب کے رونے اور ان کے قہقہبہ میں ایک متضاد کیفیت کا احساس واضح تھا۔تاہم کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ انھیں روک کر کہتا کہ تم پیچھے ہوتے جا رہے ہو۔مگر پیچھے........بہت ہی پیچھے جہاں سے ہم نے کوچ کی تھی،نہ رات ہے اور نہ ہی صبح،بس ایک مصنوعی روشنی کا سیلاب جو کبھی امڈا تھا تو ہمیں نے اپنی کرسیاں چھوڑ دی تھیں اور تب ہی آنکھیں میچ گئی تھیں۔

ان لمحوں اور آنے والے موسموں میں ہمیں اپنی کتاب اور ہاتھوں کا کچھ بھی خیال نہیں آیا........

ایک طویل دھوئیں کے بیچ کسی نے کہا یہ روشنی ہی خطرناک ہوئی۔اس لیے کوچ کا مرحلہ کس طرح اچانک وارد ہوا اس کا صحیح صحیح علم ہمیں نہیں ہے۔بعد کو،قبرستان کے قریب معلوم ہوا کہ مشورہ دینے والا معذور ہے اور اسی لیے ہم نے باری باری اپنے کندھے اس معذور کے لیے بدل لیے۔

ایک معذور آدمی کی جان دار کرسیاں ان گنت تھیں اور وہ جو سب کی میراث ہے۔اس پر سرخ بلی کا واحد اور نا قابل تسخیر قبضہ ہو چکا ہے۔

بچپن میں ہمیں نے یہ کہانی گھڑی تھی کہ بلی شیر کی خالہ ہوتی ہے۔پتہ نہیں یہ کہانی کب تک دہرائی گئی۔یہاں تک کہ شیر کو موت نے آلیا۔تب ہی معلوم ہوا تھا کہ یہی شیر نہ صرف یہ کہ ہماری اولادوں کے لیے دوسرا خود ساختہ باپ ہے بلکہ واقعات میں یہ بلی کا بھی خود

ساختہ باپ تھا........ لیکن ہمیں نے کبھی یہ منظر بھی دیکھا کہ شیر کی خفیہ گاہ میں ایک سرخ، دھاری دار، سوکھی سیاہ کھال تنہا پڑی تھی اور جس کی یاد کو ہم نے شش جہت بکھیر دیا۔ پھر اچانک تیزی اور سائنٹفک طریقہ سے ہمارے لہلہاتے پودوں، بل کھاتی بیلوں اور تناور درختوں کو کاٹا جانے لگا۔ علی الصبح اخبارات نے اپنے صفحات دھوم دھام سے سیاہ کیے اور شدید ترین دھوپ میں اپنے بے آواز اداریوں میں نباتات کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی تھی۔ پیچھے بہت پیچھے کا ورق ہے کہ ہمیں اپنی کرسیوں سے لڑکھڑا گئے اور چکا چوند کرنے والی روشنی میں آ گئے۔ روشنی کے اس سیلاب سے ایک طویل جسم کے دو ٹکڑے ہونے کی گونج دور دور تک گونجی تھی اور کافی خون بہا تھا، ہمیں نے یہ مان لیا تھا کہ واقعہ ناگزیر ہے۔

تب ہم نے اپنے نامولود بچوں کے لیے یہ جگہ مناسب خیال کی کہ اس بات کا تیقن واضح تھا۔ کرسی سبھی کی میراث ہے۔ مگر جب ہمارے بچے تعلیم گاہوں سے پلٹ پڑے تو ہمیں نے دیکھا تھا کہ یہاں بھی سرخ سانپ لیباریٹریوں میں موجود ہیں۔ آفتِ روزگار کے مارے ہم نے اپنے بچوں کو بازاروں سے واقف کروانا چاہا مگر وہاں آویزاں سائن بورڈس نے ہمیں بھگا دیا۔ ہمیں کی اولاد دُکھی سہمی سہمی اور غیر جذباتی ہو گئی۔

ایک دن: وقت کے کسی وقفہ میں انھوں نے ہمیں سے پوچھا کہ روایت میں کوئی تلوار اور حقیقت میں ایک کتاب تمھارے ہاں تھی۔ وہ اب کہاں ہے۔ ہم بوکھلا گئے۔

ابتداء ہی میں تعلیم کا علم غلط تھا۔

پھر آئے دن کے اندھیروں اور اجالوں میں ہمیں نے محسوس کیا کہ ہمارے کمر بند اور دوپٹے غائب کیے جا رہے ہیں۔ گھنٹوں کے شور میں تھکن اور اداسی ہمارے قلبوں تک کھسک آئی ہے۔ ہمارے بچے کیفوں اور نگہ داشت خانوں میں اچھوت ہو گئے اور جنھوں نے

سانسیں محفوظ کیں وہ کرسی کے زیر سایہ نغمے گانے لگے۔ آوازوں سے ہم بچ نہیں سکے۔

اب اس معذور آدمی کا خیال ہمیں انوکھا لگا اور کوچ کا مرحلہ طے ہوا۔ وہاں جہاں حقیقی صبح تھی اور بیچ کا قبرستان پار کرنا تھا۔

صبح کی ابتدائی ساعتوں میں ہمیں اسی معذور آدمی نے مطلع کیا کہ اسے اب کندھے سے اتار دیا جائے۔ ہمیں ایک سکتہ سا ہوا کہ اب بھی ہمارے پیروں تلے طویل قبرستان تھا۔ کتنے قرنوں کا قبرستان تھا لیکن ہمیں جھرجھری اس لیے بھی نہ آئی کہ معذور آدمی کے گلے میں لٹکی ہوئی زنجیر کی باگ بلّی کی خوں بار آنکھوں سے منسلک تھی۔ ہم بے اختیار قبروں سے لپٹ گئے اور اپنے بچوں کو یاد کیا، جواب بھی کیفوں اور نگہداشت خانوں میں بے سدھ ہو کر بھی اپنی روایتی تلوار اور حقیقت آمیز کتاب کی بازیافت کرنے کی سعی میں میں ٹوٹ گئے۔ ●●

پڑاؤ

''آخر کیوں میں نے اس عذاب میں خود کو مبتلا کر رکھا ہے۔'' اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے کھولتے ہوئے خود سے پوچھا۔ برآمدے میں ہوا کا سرد جھونکا میرے چہرہ سے گذر گیا۔ کنٹوپ میں نے پہن رکھا تھا۔ دالان میں پاؤں رکھتے ہی سردی کا سرد احساس موزوں سے ہوتا تلوؤں تک پہنچ گیا۔ ابھی تک دھند لکا پوری طرح مسلّط۔ خلاف معمول اماں جاگی نہیں تھیں ورنہ وہ حسبِ معمول مجھے ٹوکتیں۔ آنگن میں میرا سفید اسکوٹر نیم کے پیلے پتوں سے پوری طرح ڈھک سا گیا تھا اور سارے آنگن میں نیم کے پیلے پتوں کی چادر سی بچھ گئی تھی۔ موسم پت جھڑ ہے۔ جوتے پہن کر میں نے آنگن میں بڑی آہستگی سے اپنے پاؤں رکھے۔ پتوں کی چر چراہٹ ابھری، سامنے نیم کا درخت ننگا کھڑا تھا۔ ساری شاخیں لنڈ منڈ سی ہو گئیں تھیں۔ اوپر ہی اوپر کہرے کی چادر تنی تھی۔ آسمان دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں نے اپنا اسکوٹر صاف کیا۔ ہتھیلیوں پر نمی اور آری نما پتیوں کی چبھن کا احساس ہوا۔ اسکوٹر کو آہستگی سے ڈھکیلتے ہوئے میں نے گھر کا آخری دروازہ کھولا۔ گمان گذرا کہ اماں کی آواز پیچھے سے نہ ابھرے۔ گلی میں

سناٹا تھا۔ اسکوٹر کھڑا کیا اور آہستگی سے دروازہ بند کیا اور اطمینان کی سانس لی مگر ذہن میں یہ خیال آیا۔

''کیا یہ عذاب کلثوم کے لیے تھا!'' مجھے یہ بہت حد تک بے معنی سا لگا۔ ''تو پھر کیا اس عذاب کا تعلق تنیش سے ہے؟'' مجھے یہ بہت حد تک بے معنی سا نہیں لگا۔ اسکوٹر سٹارٹ کرتے ہوئے مجھے یہ خدشہ لگا رہا کہ گلی کی مسجد سے کوئی آواز نہ لگائے۔ اسکوٹر سٹارٹ کرتے ہی تیزی سے گلی کو پار کیا۔ سرد ہواؤں کے تھپیڑے چہرے اور سینہ پر وار کرتے رہے۔ دوسری گلی کے موڑ پر میں نے اسکوٹر روکا۔ اسکوٹر سے ملحقہ بیاگ سے سوئٹر نکالا۔ اپنے سینے کو ملتے ہوئے امکانی گرمی اور راحت پیدا کرنے کی کوشش کی اور سوئٹر پہن لیا۔

میرے سینہ پر سے اپنا سٹیتھسکوپ ہٹاتے ہوئے ڈاکٹر رحیم نے اپنا چشمہ درست کیا۔ تب تک میں پسینہ سے شرابور ہو چکا تھا۔ فین بھی بند تھا۔ ہر روز کی طرح غالباً بجلی جا چکی تھی۔ آج گرمی بھی معمول سے زیادہ تھی۔

''میں نے تمھاری رپورٹس دیکھ لی ہیں۔ شوگر کا کوئی پرابلم نہیں ہے۔ بلڈ پریشر بھی کنٹرول میں ہے۔ یلو فیور Yellow Fever بھی نہیں ہے۔ جس کے خدشہ میں تم یہاں آئے ہو۔ ہر چیز نارمل ہے۔ ہلکا سا انفیکشن ہے۔ مگر''......... وہ پھر اپنا چشمہ درست کرنے لگے۔ میں ہمہ تن گوش تھا۔

''مگر تمھیں سگریٹ کم کرنا ہوگا۔'' انھوں نے میرے سینہ کی طرف شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے سگریٹ چھوڑ دی ہے۔'' میرے لہجہ میں افتخار تھا۔

''کب؟''

''کوئی........ کوئی آٹھ روز سے'' میری آواز میں لرزش تھی۔

''دیکھو میاں''۔انھوں نے اپنا چشمہ میز پر رکھتے ہوئے کہا''سگریٹ نوشوں کے ذہن میں ایک پیلا حلقہ نمودار ہوتا ہے۔سالہا سال کی سگریٹ نوشی سے'' وہ خاموش ہو گئے۔

''پھر'' میں نے رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے انھیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''پھر یہ کہ یہ Yellow Ring سگریٹ ترک کرنے کے بعد نو سوا ایک دن میں غائب ہو جاتا ہے۔''

''کیا یہ کوئی جدید تحقیق ہے۔'' میرے لہجہ میں تمسخر تھا۔

''نہیں یہ میری تحقیق ہے۔'' ان کے لہجہ میں فخر تھا۔

''مگر آپ تو دماغ کے ڈاکٹر.........

''ہاں ہاں میں دماغ کا ڈاکٹر نہیں ہوں۔''

''پھر دماغ میں Yellow Ring''

''دماغ میں نہیں بلکہ ذہن میں Yellow Ring نمودار ہوتا ہے۔'' وہ میری بات کاٹتے ہوئے مسکرائے۔

''پھر مجھے؟''

''ہاں میاں! تم کو ابھی آٹھ سو بیانوے دن سگریٹ چھوڑنا ہوگا۔'' انھوں نے کرسی سے اٹھ کر میرے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔'' میری ایک ہدایت گرہ میں باندھ لو۔''

''وہ کیا؟'' میں نے تشویش سے پوچھا۔

''تمھیں زندگی بھر سردی سے بچنا ہوگا۔ مائنڈ اٹ انور میاں۔''

''آج آپ بڑی فرصت میں ہیں۔'' میں نے یوں ہی بات کاٹی۔

''ہمیشہ ہی'' انھوں نے ہاتھ گھماتے ہوئے اشارہ کیا۔'' کیا میری ڈسپنسری کی ساری دیواروں پر تمھیں کوئی بورڈ نظر آتا ہے۔''

'' کیسے بورڈ؟''

'' کیا تم نے کبھی ڈاکٹر کوٹھاری، موٹاری، اٹاری........ کے مطب کی سیر نہیں کی ہے۔ اردو کے لکچرر صاحب......... ایک انبوہ کہ گرفتار ہے جاری عذاب میں'' انھوں نے سلام کرتے ہوئے دانت نکالے۔

''عذاب'' اسکوٹر سٹارٹ کرتے ہوئے میں نے روڈ میں جست کی۔ کولتار کی لانبی سڑک نم آلود لگی۔ شاید شبنم بھی کافی برس چکی تھی۔ سامنے فٹ پاتھ پر آباد ہوٹلوں میں روز کے شناسا چہرے دکھائی دیے۔ یہ لوگ بے فکرے تھے یا فکر مند، پتہ نہیں چلتا تھا۔ ظاہر ہے کہ کوئی فکر کوئی الجھن ہی انہیں اس سرد موسم میں گھر سے باہر کھینچ لانے میں محرک رہی ہوگی۔ جامع مسجد کے کٹے پر لوگ ہاتھ پھیلا پھیلا کر کسی بات کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے دو ایک کے سلاموں کا اشارے سے جواب دیا۔ اب سڑک پر بائیسکلوں کی قطاریں درس گاہوں کی طرف رواں دواں تھیں۔ میں نے کلثوم کو دیکھنے کی سعی کی مگر لاحاصل، ایک تو اس کی بائیسکل کا رنگ گہرا فنکسی اور دوسرے دور دور تک گہرا کہرا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے ہیڈ لائٹ آن کی۔ مجھے اپنے بدن پر ہزار ہا گدلے، زرد مینڈکوں کی گدگداہٹ کا احساس ہوا، گویا میں کہرے کے اندر ہی اندر تھا مگر یہ دور دور تک ڈولتا ہوا دکھائی دیتا تھا مگر اپنے گرد دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آدمی جس شئے میں گرفتار ہوتا ہے وہ دکھائی نہیں دیتی اور جس شئے میں اسے گرفتار ہونا ہے وہ دکھائی دیتی ہے۔ میں نے سوچا ایک لمحہ کے لیے میرے ہاتھ کانپے، میں نے اسکوٹر کو بریک لگائی۔ زرد گدلے مینڈکوں کا ہجوم میرے چہرے کو نم کرتا گذرتا رہا۔

میں نے رک کر چہرہ صاف کیا۔ سڑک کی داہنی گلی اور پھر گلی کی بائیں طرف گلی کے وسط میں منور جناب کا حویلی نما گھر تھا۔ کیا میرا اس وقت وہاں جانا مناسب ہوگا؟ میں تھوڑی دیر تذبذب کے عالم میں سڑک پر رکا رہا۔ کل دوپہر جب میں اپنی آرٹس کلاس ختم کیے نکلا تو کینٹین کے قریب سے آواز آئی۔

''سر'' آواز میں کپکپاہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔

''سر۔ اطو چاچو آپ کو پوچھ رہے تھے۔ دادا ابو کو کل ہی حیدرآباد سے لائے ہیں۔ بشریٰ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''کیسی طبیعت ہے اب'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

''وہ......... دادا ابو کا دایاں جسم مفلوج ہوگیا ہے''........ وہ رونے لگی، میں مزید کچھ کہے سنے بغیر آفس کی طرف نکل گیا۔ شرما سپرنٹنڈنٹ سے مومینٹ رجسٹر طلب کی اور Exit Time کا اندراج کیے باہر نکلا۔ جاتے ہوئے بالکنی پر نظر دوڑائی پھر لائبریری کے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ اسکوٹر نکالتے ہوئے الکٹرک پول کی طرف دیکھا۔ فنکسی رنگ بائیسکل موجود تھی مگر کلثوم نظر نہیں آئی۔ زرد رنگ کا اسکوٹر بھی موجود تھا۔ میں منور جناب کی طرف روانہ ہوا۔ جناب کی اور میری عمر میں کافی تفاوت ہوگا پھر بھی میرا زیادہ وقت ان ہی کے ساتھ گذرتا رہا تھا۔ وہ اس جاگیر کے سربرآوردہ اشخاص میں سے ایک تھے۔ جھریوں سے بھرا سرخ وسفید روشن چہرہ، علم کا پیکر تھا۔ ان کی تیز طرّار بھوری آنکھیں، چہرہ کا سب سے جاذب نظر حصہ تھیں۔ یوں لمبی ستواں ناک لمبوترے چہرے کا آہنگ بنائے رکھتی۔ لمبے اڑتے سر کے بھورے بال، ان کی وجاہت میں اضافے کا باعث تھے۔ آواز میں بلا کا رعب تھا۔ مخاطب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کرنا انھیں پسند تھا۔ میں نے کبھی انھیں اس ترقی پذیر شہر کو نام

سے معنون کرنے نہیں سنا۔ وہ اسے ہمیشہ جاگیر کے نام سے یاد کرتے تھے۔

''بالکل'' انھوں نے اپنی کہنیوں کو گاؤ تکیہ میں گاڑتے ہوئے اپنی کمر سیدھی کی اور کہا'' میاں یہ جاگیر، تاریخ میں کئی حکم رانوں اور تہذیبوں کی آماج گاہ رہی ہے۔ یہ کئی بار اجڑی اور کئی بار بسی اور..........

''قطع کلام معاف ابو.......... شربت پی لیجیے۔'' اطہر بابا نے شربت کا گلاس مجھے بھی دیا اور اندر چلے گئے۔

''اور میں بتا رہا تھا کہ یہ اجڑا دیار، آخر کار تاج دار دکن نے اپنے دور کے داماد، جاگیردار نواب ذاکر حسین خاں صاحب کو بہ طور تحفہ ''یہ جاگیر'' عنایت کیا اور اسے ان کی عمل داری میں دے دیا۔ نواب صاحب کے ہم راہ ان کا خاندان بھی بہ حیثیت اتالیق یہاں آیا اور مختلف عہدوں پر کارگذار رہا۔ یہاں تک کہ پولیس ایکشن کا حادثہ رونما ہوا۔''

''پولیس ایکشن کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''پولیس ایکشن ہماری حماقتوں کا جواب، غیروں کی سازشوں کا شاخسانہ اور غفلتوں پر وقت کا تازیانہ تھا۔''

''کیسے؟''

''دیکھو میاں۔'' انھوں نے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔'' تاریخ شاہد ہے کہ اس طرح کے حادثات میں ہر طرح کا خون خرابہ، لوٹ مار، عصمتوں کی بے حرمتی، عبادت گاہوں پر حملہ، حاکمِ وقت کی بے بسی.......... معمول کی کارروائیاں ہیں۔ مگر....... مگر'' وہ چپ سے ہو گئے۔ مجھے بے چینی سی محسوس ہوئی۔ ایک طرح کا حبس دیوان خانہ پر مسلط ہوا۔ میں نے سگریٹ کی ڈبیہ ان کی طرف بڑھائی انھوں نے تمتماتے چہرے کے ساتھ ایک لمبا

کش لیا اور گویا ہوئے۔

"مگر یہ کہ امن کے اعلان اور اس کے قائم ہو جانے کے بعد بھی دہشت کا ماحول، آئے دن کا معمول بن گیا تھا۔ شریفوں کا گھر سے نکلنا محال کر دیا گیا۔ اس عرصہ میں ایک ہی کام بلا خوف و پشیمانی مسلط کیا جا رہا تھا۔ "قبضہ گری" انعامی زمینات ہڑپ لی گئیں۔ اوقاف کی جائیدادوں کو اپنے نام منتقل کر لیا گیا۔ لاتعداد عمارات و آثار پر قبضہ کیا گیا۔ کوئی شنوائی نہیں۔ بس چہار سمت دہشت اور خوف کو منظم اور منصوبہ بند طریقہ سے طاری کیا گیا تھا۔" انھوں نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ بہت دیر تک وہ خاموش رہے اور سوچ میں ڈوب گئے۔ میں نے اجازت لی اور باہر نکل آیا۔ دور بہت دور بوڑھا تھکا ماندہ سورج ٹیلے کی اوٹ سے ہانپتا دکھائی دیا۔

اب یہاں دھند اور کہرا چھٹتا دکھائی دے رہا تھا۔ سورج کی زرد کرنیں کہرے کی چادر میں چھید کرنے لگی ہیں۔ دوپہر ہی کو جانا مناسب ہوگا۔ میں نے کنٹوپ بیاگ میں رکھا اور اسکوٹر آگے بڑھا دیا۔ کالج کا پھاٹک پوری طرح کھل چکا ہے۔ اسٹاف گیراج میں میں نے دیکھا زرد اسکوٹر موجود تھا۔ باہر نکلا تو سامنے الکٹرک پول سے فنکسی رنگ بائیسکل ٹکی ہوئی ہے۔ آفس میں ابھی کوئی آیا نہ تھا۔ میری کلاس کے لیے ابھی وقت تھا۔ اس عرصہ میں ستیش مجھ سے زہر خند لہجہ میں کہتا رہا تھا۔ "یار تم تو ہمارے واچ ڈاگ / کلرک / لکچرر ہو گئے ہو۔"

میں نے الماری کھولی۔ اڈمیشن رجسٹر اور فارم کو میز کی ٹرالی میں رکھا اور بے صبری کے ساتھ کمپیوٹر روم کی طرف بھاگا۔ کالج کے سبزہ زار میں بنے راستوں پر رنگ برنگے لباس میں، تتلیوں کی مانند، اسٹوڈنٹس کلاس رومس کی طرف رواں دواں تھے۔ پتہ نہیں کیوں کالج انتظامیہ ڈریس کوڈ کے مسئلہ کو برسہا برس سے ٹالتا آ رہا تھا۔ میں نے دوایک کی وش کا ہاتھ کے

اشارے سے جواب دیا۔ باغ کے کئی حصوں پر اشوکا ٹریز سنتریوں کی مانند ایستادہ تھے۔ میں تیخ زدہ ریلنگ کے سہارے سیڑھیاں چڑھنے اور کمپیوٹر لیب کے دروازہ کے قریب رک گیا۔ اندر آٹھ دس اسٹوڈنٹس اپنے اپنے کمپیوٹر پر نگاہیں جمائے موز اور کی بورڈ پر مصروف کار تھے۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا ستیش کلثوم کی پشت پر کھڑا اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں آگے کچھ دیکھنے کا حوصلہ جٹا نہیں سکا۔ وہ اب چوتھے سمیسٹر کی اسٹوڈنٹ تھی۔

''بس صرف ایک سمسٹر کی ہی فیس لیجیے گا۔'' جواد صاحب کے لہجہ میں درشتگی تھی۔

''انکم سرٹفکیٹ'' میں نے فارم بھرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ ذرا بیگ سے نکالو بیٹا۔'' انھوں نے اپنی لڑکی سے کہا۔ تب میں نے ایک بار کلثوم کو غور سے دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی غلافی آنکھوں کے سوا اور کوئی چیز یاد نہیں رہتی۔

''یہ لیجیے'' جواد صاحب نے سرٹفکیٹ میری طرف بڑھایا۔

''اگری کلچر لیبر؟''

''اور نہیں تو کیا؟ ہماری پانچ ایکڑ زمین تو آپ لوگوں نے اونے پونے دام میں ٹھگ لی۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے انور صاحب بڑا لمبا قصہ ہے۔''

''جی! مگر میری عمر کا اس سے کیا تعلق؟''

''وہی تو۔ آپ کو علم نہیں نا۔ یہ جو آپ کے کالج کی لمبی چوڑی بلڈنگ ہے۔ یہ جو آپ کی لیبارٹریز ہیں۔ یہ جو آپ کا لمبا چوڑا پلے گراؤنڈ ہے نا۔ سب کچھ ہماری انعامی زمین پر

ہے۔''

''آپ نے بیچ دی ہوگی۔''میں نے فارم بھرتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں بیچ دی اونے پونے۔کیا کرتے۔ابا مرحوم کہتے تھے انھیں کچہری طلب کیا گیا تھا۔ایم ایل اے موجود، کمشنر، تحصیل دار، انسپکٹر پولیس، تلاٹی پتہ نہیں اور کون کون...... سب ٹوٹ پڑے ابا پر، کہ یہ انعامی زمین ہے۔حکومت جب چاہے اسے واپس لے سکتی ہے شہر کے ڈیولپمنٹ کے لیے،اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ اس نیک کام میں تعاون کریں اور زمین ہمارے حوالے کردیں۔''وہ ہانپنے لگے۔

''مگر یہ حکومت کو نہیں بیچی گئی۔''میں نے کہا۔

''وہی تو۔حکومت نے تو پہلے ہی ہماری اجازت کے بغیر زمین کے ایک حصہ پر کمیونٹی ہال بنوالیا تھا۔اور انتظامیہ دھمکی دے رہا تھا کہ ساری زمین کو ایکوائر کرلیا جائے گا۔''

''پھر یہ زمین کالج.........''میں نے اپنی زبان روک لی۔

''حکومت کے سارے کارندے آپ کے سوامی جی کا کام کررہے تھے صاحب اور بالآخر ہماری زمین اونے پونے دام آپ کے سوامی جی کے ٹرسٹ کے حوالے کردی گئی۔''

''ڈیولپمنٹ چالان رسید''میں نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ لیجیے۔پورے پندرہ ہزار کی ہے۔مگر بڑی مشکل سے پرنسپال صاحب راضی ہوئے ہیں۔پورے پچیس ہزار مانگ رہے تھے۔میں نے اپنی زمین کی بابت کہا تب کہیں بچی کے داخلہ پر راضی ہوئے۔''

میں نے رسید لی۔کل ہی ایک داخلہ فارم دس ہزار کی رسید پر داخل ہو چکا تھا۔

کلثوم کے کھنکھناتے قہقہہ پر ہڑبڑا کر میں نے ریلنگ سے ہاتھ اُٹھالیا۔گھنٹی بج چکی

تھی۔ستیش سرخ جیکٹ پہنے میری طرف آ رہا تھا۔

''بہت دیر سے ہو اوران بے جان چیزوں میں دلچسپی لے رہے ہو۔اس نے جگت تالاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔مگر یار، سچ بات یہ ہے کہ کالج اس تالاب کے کنارے نہ بنایا گیا ہوتا تو اس کی خوب صورتی زیرو ہوتی۔کیوں؟''

میں خاموش رہا۔اس کے کالے چمکتے چہرہ کے ہاؤ بھاؤ دیکھ کر ہی میرا خون کھول رہا تھا۔

''اچھا۔تم کو ایک بات بتانا تھی۔''اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے کاندھوں پر رکھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔''یار.........دیکھو بھڑکنا نہیں.........میں صرف اپنی معلومات تم سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہوں''میں نے کہا۔

''یار تم لوگوں میں یہ کیا رواج ہے کہ تمھاری لڑکیاں شادی سے پہلے برا Bra نہیں پہن سکتیں۔''

میں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔سارا دن کوفت میں گذرا۔کینٹین میں ہی دو روز کی رخصت لکھی اور اسے شرما کے حوالے کر کے گھر آ گیا۔

دوسرے دن دیر گئے تک یوں ہی سوتا رہا۔سر میں انگلیاں پھیرنے کے احساس پر آنکھیں کھولنا مناسب خیال کیا۔اماں تھیں۔میں نے اٹھنا چاہا۔اماں نے روک دیا۔''چل ہاتھ منہ دھو لے ناشتہ تیار ہے۔''اماں نے کہا۔

ناشتہ کرتے ہوئے میں نے اماں سے پوچھا۔''ابا کی کوئی اطلاع آئی پندرہ روز تو ہو گئے سب کو جا کر۔''

''ابھی آٹھ دن رہیں گے وہاں۔'' اماں نے جھلاہٹ سے کہا۔

''کیوں؟''

''پھنسالیا ہوگا خود کو رشتہ داروں کی پشتینی جائیداد کے جھمیلے میں''

ناشتہ سے فارغ ہوکر میں نے نیم کے درخت کو دیکھا۔ پت جھڑ نے اس کی کایا ہی پلٹ دی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں منور جناب کے حضور چل دیا۔

منور جناب کا دایاں اور بایاں حصہ پوری طرح مفلوج ہو چکا تھا۔ ان کی شعلہ بار آنکھیں ماند پڑ چکی تھیں۔ میں ان کے سرہانے دیر تک ان کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا کہ اچانک موبائل رنگ ہوا۔ پرنسپال کی کال تھی۔

''It is an urgent matter'' فوری پہنچو۔''

کافی شش و پنج میں کالج پہنچا۔ الکٹرک پول پر نظر پڑی۔ ایک دھچکا سا لگا۔ پرنسپال کے چیمبر میں داخل ہوا۔ جواد صاحب آگ بگولہ ہو رہے تھے۔ پرنسپال نے مجھے دو کاغذات سونپتے ہوئے کہا۔

''Deal it properly، مجھے تمھاری سروس بک چیک کرنی ہے۔''

جواد صاحب انھیں آواز دیتے رہے مگر پرنسپال روم سے نکل گئے۔ میں نے دونوں کاغذات یکے بعد دیگرے دیکھ ڈالے۔ پہلا کاغذ ستیش کی ایک ہفتہ کی رخصت تھی جو منظور کر لی گئی تھی۔ دوسرا کاغذ جواد صاحب کا شکایت نامہ تھا جس میں ستیش کی برطرفی کا مطالبہ تھا۔

''کیا معاملہ ہے۔'' میں نے تشویش سے پوچھا۔

''اس کمینے ستیش کو فوری ملازمت سے برطرف کردیں۔ اس نے میری بچی کو ورغلایا ہے۔''

''آپ کو کیسے پتہ''

''حرافہ نے کال کی تھی کہ وہ خبیث اس کے ساتھ ہے۔ میں پولیس تک جاؤں گا۔''

''کس جگہ ہیں وہ لوگ''

''یہی تو نہیں بتلایا۔ کہتی ہے آٹھ روز میں آئیں گے۔''

''دیکھئے جواد صاحب حالات آپ کے موافق نہیں.......... اس میں آپ کی ہی سبکی ہوگی۔''

''پھر میں کیا کروں۔ یا اللہ۔ یہ کیسا عذاب ہے؟''

''پاس پڑوس....... اور کسی کو علم ہے؟''

''نہیں۔''

''مجھے غلط نہ سمجھئے'' میری آواز کانپی'' آپ بھی کچھ دنوں کے لیے ترک مقام کر لیجیے۔''

''جی مگر........''

''بعد میں حالات کے مطابق بات بنائی جاسکتی ہے۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا، اور باہر نکل آیا۔

''میں نے سروس بک چیک کر لی ہے اور اسے اپروول کے لیے پریسڈنٹ کے پاس بھیج رہا ہوں۔'' پرنسپال کی آواز ابھری اور میرے تصور میں سوامی جی کا زرد صافہ لہرایا۔

اسکوٹر پر سوار ہوتے ہی میری نظریں خود بہ خود اس طرف اٹھ گئیں۔ مگر اب وہاں کیا تھا؟ سوائے ایک سخت کھردرے سمنٹ کے الکٹرک پول کے۔ ●●

اسیرِ ہندسہ

تعلیمی سازش کا ہتھیار زنگ آلود ہو چکا تھا۔

ایک رات، میں، سرزد ہونے والی چوری میں، چپکے سے، اس روئی سے اٹے کمرہ میں سگریٹ کے دھوئیں کو اپنے لحاف میں چھوڑ رہا تھا کہ لائٹ آف ہوگئی۔ اندھیرے میں دھواں میرے ساتھ اٹھا۔ میرے قدم ایک دوسرے پاؤں سے ٹکرا گئے۔ اپنے ذہن میں خفت کا بوجھ لیے میں میٹر بکس کے قریب رک گیا تاکہ فیوز کو دیکھ سکوں، سگریٹ کے کش سے ابھرتی ہوئی روشنی میں میں نے دیکھا کہ فیوز کے دونوں تار محفوظ ہیں، فیوز کو پھر سے اندر دباتے ہوئے میری نظریں غیر ارادی طور پر میٹر پر رک سی گئی۔ 469 نظر آیا۔ کہیں دبا ہوا تجسس پیشانی کی شکنوں سے واضح ہوا۔

''ہاں 469 ہی ہے'' میرے منہ سے نکلا۔

وہ 4 ہی ہے جس سے ٹکرا کر میں نے خفت کا بوجھ اٹھایا تھا۔ 6 تو میں ہی ہوں اور 9

........میں غور کرتا گیا، میں نے بالآخر اسے دریافت کیا اور مسکرا دیا۔ میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ جلد میری گرفت میں کیوں نہیں آیا تھا۔ہم دونوں کی وابستگی میں ابھی وہ لمحہ نہیں آیا تھا۔ جب آواز آنکھ سے سنی جاتی ہے اور بصارت کانوں کی محتاج ہوتی ہے۔

''تو وہ 9 ہی ہے، ایک لمحہ کے لیے پیشانی کی شکنیں لبوں پر سفر کر گئیں۔!

پھر میرا یہ سفر، ایک دوسری شکل میں 469 کی کوکھ سے شروع ہوا۔اس سفر کی منزل پر مجھے جو ہندسہ نظر آیا تو چند ثانیوں کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ سارے شہر کا کرنٹ میرے اندر بہہ رہا ہے............اس ہندسہ کی کوکھ سے میں نے 1 کی بازیافت کی۔

''اکائی ہمارا مقدر ہے'' میرے منہ سے نکلا۔

نہیں ہمارا نہیں چوں کہ میں نے سفر کیا ہے اس لیے اکائی میرا مقدر ہے۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں نے ہمارا کہا۔ پھر اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے میں نے سوچا ہر آدمی جو 'ہمارا' کہتا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ آبادیوں میں رہتا ہے اگر چہ اس 'ہمارا' میں وہ لاشعوری طور پر 'میرا' سے قریب تر ہوتا ہے۔ سالہا سال کی سماجی زندگی.........انگلیوں کے جلنے کے احساس پر، سگریٹ کا ٹکڑا سوئے ہوئے کے قریب پڑ گیا۔ نیند کی حالت میں ہی اس نے سگریٹ بجھا دیا۔ تب مجھے خیال آیا کہ بہت سے لوگ جاگتے ہیں۔ سوتے نہیں تا کہ جاگنے کا عمل پر اسرار کر سکیں۔

میں نے اکتا کر نیند کرنا چاہی مگر رہ رہ کر یہی خیال سامنے رہتا کہ شاید 9 بھی سو نہ رہا ہو؟ پیاس کی شدت لیے میرے پاؤں رسوئی گھر میں داخل ہوئے۔ 9 پانی پی رہا تھا۔ اور میں بھی۔ مگر میرے ہاتھوں کو کسی سخت چیز کے پکڑنے، منہ تک لے جانے کے عمل سے نہیں گزرنا پڑا۔ 9 بھی دیر تک اپنے منہ سے گلاس کو لگائے، مجھے پیاس بجھانے کا موقع دیتا رہا۔

میں نے مناسب جانا کہ کوئی بھی چیز تصور سے پیاس نہیں بجھا سکتی۔ کیوں کہ جہاں کہیں شدت آجاتی ہے تصور دم توڑے عمل کے وجود کو پانے کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔ اس لیے قدم اٹھ گئے اور چھن سے گلاس گر جانے کی آواز، ایک لمحہ کے لیے قندیل کی روشنی کو جھلملا گئی۔

جب دو نازک لمحے میرے نازک لمحوں سے پیوست ہو گئے تب ہم دونوں کو محسوس ہوا کہ وہ منزل آہی گئی جب آواز آنکھ سے سنی جاتی ہے اور بصارت کانوں کی محتاج ہوتی ہے۔

وہ شاید گلاب پانی، نہیں نہیں۔ اس کی خوش بو، مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں سیب کے درختوں کے جھنڈ میں مدہوش آگے بڑھ رہا ہوں۔ دور بہت دور، اچانک اس سفر کو ٹھوکر سی لگی اور 9 نے کہا 'تم سگریٹ بہت پیتے ہو'،

میں نے جواب دیا ''تم سیب بہت کھاتے ہو'' کچھ لمحوں کے لیے 9 کا چہرہ قندیل ہو گیا۔ میں نے لپک کر کسی وحشی ہراساں مسافر کی طرح قندیل اٹھالی قندیل کی روشنی جھلملاتی رہی اور میری انگلیاں اس روشنی کی آگ میں لذت حاصل کرتی رہیں اور آخر ہم دونوں 15 بن گئے۔

ہم دونوں کو اپنے لباس کی پاکیزگی کا احساس تھا اس لیے فوراً 9 اور 6 ہو کر لباس کی شکنیں درست کرتے رہے اس اثنا میں 9 میرے جسم پر لگے ہوئے ایک بال کو علاحدہ کرتا اسے اپنی انگلیوں پر لپیٹتے ہوئے چل دیا، میں نے گلاس کو سیدھا کیا اور پھر میرے قدم روئی اسے اٹے کمرہ کی جانب بڑھنے لگے۔ اچانک روشنی آگئی۔

4 جاگ رہا تھا!!

میں لحاف میں، منہ ڈھانپے سوچنے لگا۔ ''شاید 4 نے آج ببول کے جنگل کی سیر کی ہے۔''

ان دنوں میٹر نے 694 کے ہندسے دکھانے شروع کیے۔ مجھے اپنے ہندسہ کی اولیت سے خمار سا ہوتا، خمار ہمیشہ اولیت کے بطن سے پیدا ہوتا ہے اور مجھے اپنی اس تخلیق پر خوشی ہوتی لیکن 4 اکھڑا اکھڑا رہتا..........

پھر ایک دن جب میٹر نے 964 کے ہندسے دکھائے میں پریشان اور 4 چونک اٹھا.......... 6 اور 4 کی جبلت کی ہوا تند ہوا کرتی ہے جو کچھ وقفوں میں دم توڑ دیتی ہے ان ہواؤں کا حال گرما کے ان جھکڑوں کی طرح ہوتا ہے۔ جو اپنے اطراف گھیری ہوئی چٹانوں کو دیکھ کر اپنی ساری تندی کھو بیٹھتے ہیں مگر 9 کی جبلت کی ہوا ایک خاموش طوفان ہوا کرتی ہے۔ جب یہ طوفان اٹھتا ہے تو تمام چٹانیں ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں۔ اور ساری دنیا کو علم ہو جاتا ہے اور ایسا ہی ہوا۔

4 تو اب تک یہی سمجھتا رہا کہ 6 کی 9 سے دلچسپی ایک متوازن جنسی عمل ہے مگر جب 9 کو بھی اس عمل میں سنجیدہ ہوتے دیکھا تو اسے ایک بدنام لفظ سوجھا۔ 4 نے اس مصروف زندگی میں قرونِ وسطیٰ کی مشہور داستانوں کو پنپتے ہوئے دیکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ حالاں کہ مجھے اس بات کا شدید احساس تھا کہ اس بدنام لفظ میں سب سے یاس انگیز لمحہ تو وہ ہے جب یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں یہ ہوس تو نہیں؟

میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ اگر لیلیٰ اور شیریں کے بھائی آج زندہ ہوتے، تو کیا وہ بھی اپنی بہنوں کی داستانوں کو پڑھ کر اوروں کی طرح مسرت حاصل کرتے؟ چاقو نہ نکال لیتے.........

4 نے بھی ایسا ہی کیا اور میں نے بھی اس ہتھیار کو صاف کیا جو کاٹتا کم اور کترتا زیادہ ہے۔ 4 کی کاٹ میرے کترنے کے عمل سے پھیکی تھی اس لیے اپنے ہاتھوں کو ملتے ہوئے

جانے کیا طے کر کے 4 نے اپنا ایک افسانہ اس کیفے میں بیٹھ کر سنایا جس کا نام ہندوستان کی اس ریاست سے ہے جو الجھن سے عبارت ہے۔ ہمارے دوست 7-2-5 حیران تھے کیوں کہ انھیں ہمارے کاٹنے اور کترنے کی کہانی کا علم نہ تھا۔ پھر بھی وہ اپنی اپنی حیرانی کافی میں ڈال کر پی گئے اور 4 کا افسانہ سنتے رہے۔ افسانہ ختم ہونے پر سب اس کی تعریف کرتے رہے اور میں حیرت کے غار میں منہ کھولے، انھیں اور 4 کو تکتا رہا۔ مجھے افسانے کے بنیادی تھیم نے پریشان کر دیا تھا۔ کیوں کہ یہ تھیم اس سماج میں صرف ایک ہی بار جائز طریقہ سے پنپ سکا تھا...... اور اب ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ لیلیٰ اور شیریں کے بھائیوں کی یہ تمنا پوری ہو، 4 کو خود اپنی اس لاشعوری حرکت کا احساس نہ تھا مگر، مجھے ہو چکا تھا اس لیے میں حیرت کے غار میں منہ کھولے ٹھہرا تھا، پھر مجھے احساس ہوا کہ غار سے ایک چمگاڈر نکلی جو 4 سے مشابہ تھی۔ وہ چمگاڈر، مجھے محسوس ہوا کہ میرے حلق میں راستہ تلاش کر رہی ہے۔ میں نے گھبرا کر نیچے سڑک پر تھوکتے ہوئے کہا، ''اس افسانہ میں جتنا کرب ہے اتنا منٹو کے ٹوبہ ٹیک سنگھ کو کیا ہوگا'' شعوری کرب لاشعوری کرب سے کم ہی ہوتے ہیں۔!!

یہ سنتے ہی 4 کے چہرے پر آسودگی کا جھپکا نمودار ہوا اور یہ دیکھ کر 7 نے کہا: (7 اس شہر میں اجنبی ہے۔) اچھا تو وہی ہے جامع مسجد جو تالاب کے اس پار نظر آ رہی ہے۔

میں سنجیدہ ہو گیا مگر 4 نے ہنستے ہوئے کہا، ''نہیں! وہ تو کورٹ ہے۔ مجھے سنجیدہ اس لیے ہونا پڑا تھا کہ 7 ہر گنبد نما چیز کو مسجد سمجھتا تھا اور اس کی معصومیت کا اعتراف کرتے ہوئے سوچنا پڑتا ہے کہ آج بھی انسان کے ذہن میں معصومیت کا وجود کس طرح باقی ہے ورنہ ہماری یہ زندگی جو Screws سے جکڑی جا چکی ہے کچھ لوگ..........

چرررر.......... بریک لگنے کی آواز پر ہم سب نے نیچے سڑک پر نظریں دوڑائیں۔

کاریں، بسیں، آدمیوں کا شور، کھلے گریباں اور چلتی پھرتی بیساکھیاں نظر آئیں، سر کو جھٹکتے ہوئے میں نے 7 کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور کہا ''بل تمھیں ادا کرنا ہوگا کیوں کہ تم بڑے شاطر ہو۔ وہ بل اٹھائے ہنسنے لگا۔

گھر پہنچا تو میں نے سنا کہ آج 9 کو 4 سے باندھ دیا گیا ہے۔(یہ وہ افسانہ نگار 4 نہیں تھا بلکہ، افسانہ نگار کی پسند تھا۔)

آخر، اس نے اپنی لاشعوری حرکت سے اپنے آپ کو 9 سے وابستہ کر ہی لیا۔!!!

میں نے میٹر پر نظر دوڑائی 1003 موجود تھا میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ اسی لمحہ 1003 کی کوکھ میں سفر کرتے میں نے 4 کو دریافت کرلیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے میٹر میں زندہ گاڑ دیا گیا ہے اور میرے پورے جسم میں شہر کا سارا کرنٹ بے تحاشہ بہہ رہا ہے اور مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ اپنے اطراف پھیلے مجبوری کے حصار کو توڑ کر 1003 کے ہندسہ کو پار کر جاؤں۔

تعلیمی سازش کا ہتھیار زنگ آلود ہو چکا تھا۔

اس نئے شہر میں سڑک پار کرتے ہوئے 7 نے مجھے روک لیا'' ارے میں تو تمھیں پہچان ہی نہ سکا''، میں نے اس کے لہجہ میں چھپی 9 اور 4 کی کہانی کے طنز کو محسوس کیا پھر اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا:

''یار ایک بات کہوں، برا نہیں مانو گے۔''

میں نے سامنے سڑک پر لگی ہوئی No Admission کی تختی کو دیکھتے ہوئے کہا ''نہیں'' ''یار تمھاری صورت تو جلے ہوئے تمباکو کے پتے کی طرح ہوگئی ہے۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔'' اب تم معصوم نہیں رہے کیوں کہ

معصومیت کبھی بھی حقیقت نہیں کہتی، خیر چھوڑو۔اب تو تمھیں کورٹ جامع مسجد نظر نہیں آتی۔"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی، میں نے اسے اپنے نئے مکان تک چلنے کو کہا وہ اثبات میں گردن نہیں ہلا سکا اور میں آگے چل دیا۔ نئے کمرے میں داخل ہوا، رات آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کے پٹ بند کر دیے اور کنوارے بٹن کو آن کر دیا۔ جیسے ہی میٹر میں 1 کا ہندسہ آ گیا میں نے کرنٹ آف کیا اور ایک ایسا سازشی انتظام کیا کہ اس 1 کے ہندسہ کے علاوہ تمام ہندسہ اس میٹر میں اسیری کا درد سہتے رہیں۔ بہت دیر تک میرا سکون میٹر میں ٹھہرا رہا۔ اگر چہ تمام رات میرے کمرے کی لائٹ کھلی رہتی مگر میٹر کے اندر مختلف ہندسہ میری سازش کا شکار ہو چکے تھے اور مجھے سکون مل رہا تھا۔

ایک ماہ کے اختتام پر جب Meter Reader نے میٹر کو دیکھا تو اسے میرا کرب اور سکون نظر نہیں آیا بلکہ 1 کا ہندسہ نظر آیا۔ وہ میرا کرب کیسے دیکھ سکتا تھا؟ آج کے کرب کو ہندسوں نے سمیٹ لیا ہے۔ اس کی غلامانہ رپورٹ کے بعد میرے کمرہ سے مرے سکون کا واحد علاج اٹھا دیا گیا اور مجھ پر جرمانہ عائد کیا گیا۔

جرمانہ کی کوکھ سے سفر کرتا جب میں منزل پر پہنچا تو مجھے وہاں 9 کے علاوہ کوئی نظر نہیں آیا 9 جو میری ابدی یاد ہے۔ ●●

ہندسۂ عبث

''68 میل'' .... اب تک 19 میل کی سبقت ہم نے کی تھی۔ سامنے سیٹ پر بیٹھے ہوئے عنکبوتی چہرہ والے مسافر کا کسی تکرار پر کہنا ''زمین دراصل 6 دن میں بنائی گئی ہے۔'' مجھے نڈھال کر دیتا ہے اور میری آنکھوں سے وہ ہرا بھر منظر اوجھل ہو جاتا ہے جس کو غلاف کی شکل میں اُوڑھ لینے کی آرزو ذہن میں سرسرائی تھی۔ مجھے وہ مسافر، مشتبہ دکھائی دیتا ہے بالکل 4 کی مانند۔ زمین 6 کیسے ہو سکتی ہے؟ ڈرائیور یک بہ یک آئے ہوئے ٹوٹے پل کو دیکھ، بس کو کچی سڑک پر موڑ چکا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ بہت چوکس ہے اور اس کے پیروں نے راستوں کا مفہوم جان لیا ہے۔ اس کا نام .... کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر وہ 5 ہو گا۔ اگر وہ 5 نہ ہوتا تو بس پل بھر میں گر جاتی اور پھر ایک منحوس خبر۔ اتنا تو مجھے معلوم ہی ہے کہ وہ 8 ہی ہو گی۔ اس معلوم کا علم مجھے ان پچھلے ریگ زار لمحوں میں لے جاتا ہے جب میرے لیے کوئی 5

تھا۔ خیر اگر میں فرض بھی کرلوں کہ زمین 6 ہے (اس لمحہ میری آنکھوں میں آنسو نہیں، صرف میں نے حلق کی ساری رگوں کو چند لمحوں کے لیے نگل لیا ہے) تو ابھی ابھی میں نے 8 کو اس کے ساتھ چپکے ہوئے دیکھا تھا۔ اخبارات جو بس کے حادثہ کو اہمیت دیتے ہیں ایک سیارہ کو بھلا اب تک کیوں کر مشتہر نہ کرسکے۔ یہ کوئی اجتماعی راز ہے؟ کیا اجتماعی راز اتنے جان لیوا ہوتے ہیں کہ ہر ایک اس کو پی لیتا ہے۔ مجھے تو وہ کم بخت مسافر اس زمین پر کسی 5 کے وجود سے بھی منحرف معلوم ہوتا ہے۔ نراجی، کیا وہ اخبارات کو ڈرپوک سمجھتا ہے۔ یعنی بالکل ہی 2۔ ''نرگسی'' میرے منہ سے مادرانہ کف پھنکارتے ہوئے نکلتا ہے اور میں اسے سبق دینے کے لیے چلاتا ہوں۔ ''اے مسٹر......... ''وہ پلٹ پڑتا ہے اور میں ششدرہ جاتا ہوں۔ عجیب چہرہ بن گیا ہے۔ اس چہرہ کی یلغار میں سارے منظر گم ہو چکے ہیں۔ نہ بس، نہ ڈرائیور۔ حتیٰ کہ اپنا وجود بھی محسوس نہیں ہوتا۔ ایسا لگتا ہے یہاں کے ازلی منظر سے ہی وہ چہرہ آسمان کی بلندیوں سے آج تک فضا میں لٹک رہا ہو۔ اپنے حواس درست کرنے کی دھن میں میرے منہ سے بے اختیار نکل جاتا ہے ''اگر بس پل سے گر جاتی تو؟'' اس کے آنکھیں سکیڑتے ہی ازلی منظر غائب ہو جاتا ہے اور وہ بھی ان تمام بے حس چہروں کی طرح 3 بن جاتا ہے۔ جواب دے کر وہ بے تعلقی کے انداز میں پلٹ جاتا ہے۔ ''تو احمقوں کی آرزو، ہرا بھرا خطہ دیکھنے کی خواہش، ہمیشہ کے لیے ختم ہوجاتی ہے۔''

تو کیا اس زمین پر 7 کی آرزو کرنے والے احمق ہیں۔ کیا میں بھی پچھلے ریگ زار لمحوں میں احمق تھا........ 66 میل........ مصروفیات میں گم شدہ ہو جانا ہمیشہ ایک غیر متوقع حادثہ کا باعث بن جاتا ہے۔ کیوں میں نے 67 کو نہیں دیکھا.........

میرے اعصاب باہر کی ہواؤں سے ٹکرا کر نمک کی طرح گھلتے جا رہے ہیں۔ ابھی تو

میں نے 21 میل ہی کی سبقت کی ہے۔اتنی تھکن......... سورج توانائیوں کا منبع ہے کانپتے ہوئے ڈوب رہا ہے۔اس کے لال ریشے زمین پر چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں آسمان پر ایک بہت بڑا الاؤ روشن ہوگیا ہے اور اس الاؤ کی زد میں زمین کا چہرہ سرخ ہوگیا ہے۔میری آنکھیں دو سلاخوں کے درمیان باہر کی پھیلی ہوئی لامحدود تھکن کو سمیٹ رہی ہیں۔جب تک بدصورتی یا خوب صورتی کو کشید نہیں کیا جاتا حسن ان میں عنقا رہتا ہے ورنہ ہم جو عریاں خوبصورتی یا بدصورتی میں حسن دیکھتے ہیں تو محض اس لیے کہ ہماری آنکھ ان کو کشید کر لیتی ہے۔مگر جب آنکھ میں جالے آجاتے ہیں تو کشیدگی کا عمل رک جاتا ہے اور ہر چیز اپنا حسن کھو کر ایک نامانوس المیہ کا شکار ہو جاتی ہے۔

اس دور نے مجھے سب سے بڑا کرب،اور کوئی نہیں بلکہ یہی دیا کہ میری آنکھوں میں جالے اتر آئے ہیں۔میں جو محض شاعر اور سائنس داں نہیں ہوں۔ایک جو خواب بنتا ہے دوسرا جو اس خواب میں پیہم پتھر پھینک رہا ہے۔میں چاہتا ہوں کہ اس پر شور پتھر کا وجود باقی رہے مگر اس کی جگہ میرے پیروں کے نیچے ہو اور جس پر ٹھہر کر میں خواب دیکھوں نہیں بلکہ اسے چکھتا رہوں۔میں سیدھی سادی حقیقتیں چاہتا ہوں۔کھانا کھاتے ہوئے میں صرف اس کی لذت سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں نہ کہ اس بارے میں سوچنا چاہتا ہوں کہ مجھے کسی انسانی ادارے کے بنائے ہوئے وقت کی پابندی کرنا ہے میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے کسی قسم کی باز پرس نہ کی جائے۔اگر میں کسی آدرش کا احترام کرتا ہوں تو کسی لمحہ اسے ٹھکرا بھی سکتا ہوں۔میں کسی دوزخ میں گرتے ہوئے کسی جنت کا خیال اور جنت میں داخل ہوتے ہوئے دوزخ کا خیال اپنے اطراف پھیلے ہوئے فلسفوں کی بنا پر محسوس کرنا نہیں چاہتا۔میں زیادہ تر ایسی آواز پر ہی زیادہ کان رکھنا چاہتا ہوں جو کسی اور کان سے ٹکرانے میں محو نہ ہو بلکہ خود کو سنے۔وہ نظر جو خود دیکھے

اور وہ احساس جو خود کو محسوس کرے۔ میرا ایقان ہے کہ میری تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ
وہ ہے جو میری فطری سیاہی کو سفیدی اور فطری سفیدی کو سیاہی میں بدل دینے کے جتن میں مجھ
کو پیس رہی ہے۔ میں ایسی ساری حقیقتوں سے جو مجھ پر ٹھونسی جا رہی ہیں شدید نفرت کا اظہار
کرتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ خدا نے مجھے خالص مٹی سے بنایا ہے اور اس کی یہ غیر خالص
دنیا خدا کی بھول کا انتقام مجھ سے لیے میری تکمیل میں مصروف ہے۔ میں اس لمحہ کو ابدی کر دینے
کا قائل ہوں، اور انتظار کر رہا ہوں جب انسان کا شعور اور لاشعور ایک ہو جائے۔ مجھے یہ بھی علم
ہے کہ اگر ایسا ہو جائے تو شاید اکتاہٹ مجھ پر طاری ہو جائے گی اور اس روئے زمین پر تجسس کا
لفظ مٹ جائے گا۔ لیکن جو کرب مجھ پر طاری کیا گیا ہے جس کی وجہ سے میں مٹ رہا ہوں اس
کے لیے میں یہ سوادا اپنی تمام تر وحشیت اور غیر وحشیت سے چکھنا چاہتا ہوں۔ باہر قدرتی حسن
کے کھو جانے کے المیہ میں مجھے اس دور کی سازش کا شبہ ہوتا ہے۔ یہ سازش محض خندق نہیں ہے
جو زمین سے تحت السریٰ تک جاری ہے یا آسمان تک سفر کر رہی ہے بلکہ انسانی ذہن کے بے
چین ہونے کا وہ شہتیر ہے جو ہر جگہ خلا نچیں بھر رہا ہے۔ پھر بھی بے سکون ہے، مداوا کہیں نہیں
ہے۔ قدرتی حسن کے کھو جانے کا المیہ انسانی بے چینی کے مقابلہ میں کتنا منحنی لگتا ہے۔ کہیں ایسا
تو نہیں کہ میری آنکھوں میں جو جالے اتر آئے ہیں وہ اس دور کا کرب نہیں، بلکہ حقیقت میں
اس کی لاچاری و بے چارگی ہے!! کاش ایسے میں 1 ابھر سکتا مگر ڈوبا ہوا سورج، جو توانائیوں کا
منبع ہے کیسے یک بہ یک ابھر سکتا ہے۔ ان لمحات میں کنڈکٹر کی وہ جوابی آواز مجھے دنیا کے سب
سے زیادہ سراسیمہ کر دینے والی آواز محسوس ہوتی ہے۔ اول تو میں اس آواز کا تعلق صور سے
جوڑ دیتا ہوں پھر جھنجھلا کر سائرن سے ملا دیتا ہوں کیوں کہ صور سے متعلق تو میں جانتا ہوں لیکن
سائرن کو تو آئے دن محسوس کرتا ہوں سچائی تو جاننے سے زیادہ محسوس کرنے کے عمل سے باندھی

گئی ہے۔ جب کبھی مجھے سائرن کی آواز خاموش دکھائی دیتی ہے تو میں مسکراتا ہوں۔ مجھے گمان ہوتا ہے کہ دراصل یہ ہواؤں کی سازش ہے جو ہم کو مطمئن دیکھ کر اچانک اپنی اغوا کردہ سائرن کو آزاد کردیں گی۔ مطمئن کر کے قتل کرنے کا حربہ تو اب زنگ کھا چکا ہے، ہوائیں اس معاملہ میں انسانی حس کے سامنے اڑ نہیں سکتیں۔ پھر بھی جو لوگ اپنے آپ کو مطمئن دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اس مسافر کی طرح ہیں جو ایک طویل مدت بعد خوش آئند تصور لیے لوٹ رہا ہے اور نہیں جانتا کہ وباؤں نے اس کا گھر اُجاڑ دیا ہے اور شاید اب کوئی اسے پہچانے بھی نہیں کیوں کہ آوازوں نے ہر چہرہ مسخ کر دیا ہے۔ سائرن تو ایک وبا ہے جو ہمارے اطراف منڈلا رہی ہے۔

8 اسٹیج وہ کنڈکٹر کی آواز تھی۔ اگر وہ جھوٹ موٹ ہی تسلی کے لیے 7 کہہ دیتا تو کیا بگڑتا؟......... موت کے لمحوں میں ہم کیوں جھوٹ نہیں بول سکتے، ممکن ہے اس جھوٹ سے کئی زندگیاں ہمک پڑی ہوں، مگر نہیں ہم دعا کرتے ہیں۔ ''اے خدا ہمارے گناہ معاف کر'' گویا اس جملے کے لیے ہم موت کا انتظار کرتے ہیں۔ پھر مجھے خیال آتا ہے کہ جب قدرتی موت کے لیے دعا مانگی جاتی ہے تو کیمیائی موت کے لیے کیوں نہ مانگی جائے۔ آدمی قدرتی موت کا تو ایک ہی دفعہ شکار ہوتا ہے مگر کیمیائی موتیں ہر لمحہ اس کے انتظار میں کھڑی ہیں۔ آج جب کبھی آدمی کیمیائی موت نہیں مرتا اور اسے چند لمحوں کے لیے سکون مل جاتا ہے، تو دراصل وہی لمحہ اس کی قدرتی موت ہے۔ میری آنکھیں دعائیہ انداز میں اوپر اٹھ جاتی ہیں۔ ''اے خدا تو بے کسوں کی سنتا ہے اور میں تو اس دور میں پیدا ہوا ہوں میری آرزو ہے کہ ....'' آنکھ شرمندگی کا احساس لیے جھک جاتی ہے۔ یہ احساس بات کی وجہ سے ہوتا ہے بھلا خدا سے اس بات کی اُمید دفعتاً کیوں کر کرنی چاہئے کہ ہم زہر کھا رہے ہوں اور وہ امرت

بن جائے۔ مجھے تو اپنی آرزوان ہواؤں کو بتا دینا چاہیے جو ہر کان سے ٹکراتی ہیں۔

''میں 8 کو مغلوب کرتا 9 کے سینے پر 5 کا عزم اور ہاتھ میں 1 کی قوت پکڑے تمام 4 اور 2 کو مردہ کرتا، 3 کا چہرہ بدلے 7 کا بیج بو دینا چاہتا ہوں''........

''عبث آباد'' کنڈکٹر کی آواز بیچ میں ابھرتی ہے۔مسافر چڑھتے ہیں اور مسافر اترتے ہیں۔دونوں کے چہروں پر مایوسی کا پرتو.......... منزل ملنے اور منزل کی تلاش اپنے ساتھ ایک ہی لفظ رکھتی ہے۔''عبث''..........

60 میل بس کا پہیہ اچھل کر میرے ذہن میں آ گیا ہے۔سنگینوں سے لیس ایک عفریت نہ جانے کس گوشہ سے نکل کر میرے اندر قہقہے لگا رہا ہے اس کی شکل اس مسافر کی طرح ہے جس نے مجھے احمق کہا تھا۔ میں نے چاہا تھا کہ اس زمین پر 7 کا بیج بودوں، یہ چاہ اس کی شکل ہے جو مسافر کی ضد ہے مگر اس کے ساتھ عبث دکھائی دیتا ہے۔فنا کی کسک شاید میرے دل میں اس لیے ہے کہ میرے اندر وہ مسافر بھی ہے اور اس کی ضد بھی۔ ہزار ہا شخصیتوں کو اس بات کا احساس بھی نہ ہوگا کہ میرا وجود بھی ہے۔آخر میں مکمل اکائی کیوں نہیں ہوں جس دن آدمی مکمل اکائی بن جائے گا۔شاید اسے اپنے فنا ہونے کی کسک نہ ستائے کیوں کہ وہ ہزاروں چیزوں میں مختلف نہج سے سہی مگر اکائی دریافت کرلے گا.......... میرا جی چاہا کہ اس حرکت کرتے ہوئے تابوت سے نکل کر اس پتھر کو ریزہ ریزہ کر دوں جس پر ابھی میں نے 60 کندہ دیکھا تھا۔مگر اس تابوت سے نکل کر کہاں جا سکتا ہوں۔ ہر جگہ تابوت ہیں......... حرکت کرتے ہوئے اور منجمد........ ان میں ہم اپنی مسافتیں چھوڑنے اور لینے کا جتن بڑی احتیاط سے کرنے میں غلطاں ہیں اور ایک طرح کی خوابیدگی میں ہنہنا رہے ہیں کہ ہم کتنے آزاد ہیں۔ حالاں کہ ہم ان تابوتوں میں پڑے ہوئے پتھروں میں کندہ ہیں یہ تابوت جب چاہتے ہیں اپنی

روش سے ہم کو ایک پتھر سے آزاد کرتے ہیں ساتھ ہی دوسرے پتھر میں اسیر کر دیتے ہیں۔ میرا سر سلاخوں میں نڈھال پڑا ہے۔ حرکت کی زد میں آ کر زمین ذرات بکھیرتی جا رہی ہے۔ نیم تاریکی میں مجھے ان ذرات سے ایک ہیولی بنتا دکھائی دیتا ہے وہ اپنی دھول خوار آنکھیں جھکائے مجھ سے پوچھتا ہے۔ ''تم نے غور کیا کہ زمین کے ساتھ عبث کیوں چپک گیا ہے۔ میں چپ ہی رہتا ہوں وہ سوالیہ انداز میں پوچھتا ہے۔ ''تم جانتے ہو میں کون ہوں۔'' میں زمین کا ناظر ہوں۔ وہ خود ہی جواب میں کہتا ہے۔ ''تمھیں وہ منظر دکھاؤں کہ اس زمین پر تم نے کس ہندسہ کو کن معنوں میں پایا اور کن معنوں میں کھو دیا.......... وہ اپنا حلق کھول دیتا ہے۔ میری آنکھیں اس ٹیلے نما حلق میں گھس جاتی ہیں۔

منظر 1: ایک کہنہ تاثرات رکھنے والا بوڑھا جدید لیبارٹری میں چلاتا ہے۔ ''پاؤڈر تیار ہو گیا۔'' .... دیوار میں چھپے ہوئے حکم راں باہر نکلتے ہیں۔ ''ثبوت؟'' ...... بوڑھا جواب دیتا ہے۔ ''زمین کو لاؤ'' .... روشن دانوں میں ایستادہ برق انداز اُڑتے ہیں اور اپنے ہاتھوں میں زمین کو اُٹھائے داخل ہوتے ہیں۔ بوڑھا زمین کو ٹیوب کی خیف پر رکھ دیتا ہے جس میں پاؤڈر کا محلول ابل رہا ہے۔ اچانک زمین ٹیوب میں حل ہو جاتی ہے حکم راں چلا اٹھتے ہیں۔ ''طاقت''

منظر 2: بند کمرے میں ایک فرد کی آواز ابھرتی ہے، تمھاری لائنیں دائمی نہیں ہیں۔ یہاں اس خطہ کا رشتہ زمین سے ابدی ہے۔ نیلے رنگ کی جیکٹ پہنا ہوا آدمی تلملاتا ہے۔ ''ہم یہاں فلسفہ سننے نہیں بلکہ یہ جاننے جمع ہوئے ہیں کہ تمھارے علم میں خطہ کس کا ہے'' .... پہلا فرد ہرے رنگ کی جیکٹ پہنے ہوئے آدمی کو دیکھ سوچتا ہے کہ آج سچ ہی کہہ دے مگر اچانک اس کے ذہن میں ایک تصویر ابھرتی ہے۔ وہ ایک لانبے سانپ سے باندھا جا رہا ہے۔

باندھنے والا نیلے رنگ کی جیکٹ پہنے ہوئے ہے۔سانپ کی گردن کو دباتے ہوئے وہ ایک مائع گلاس میں بھر لیتا ہے اور بندھے ہوئے آدمی کے قریب جا کر کہتا ہے۔''سچ کا انعام''...... وہ اپنا ذہن جھٹکتا ہے تصویر غائب ہو جاتی ہے۔ڈیڑھ سو افراد کی سوالیہ نظریں اس کی جانب اٹھی ہوئی ہیں۔اچانک اس کے منہ سے نکل جاتا ہے۔''وہ خطہ نیلے رنگ کی جیکٹ والے سے وابستہ ہے۔''

منظر3: ایک آدمی کرسی پر رسیوں سے باندھا گیا ہے۔اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔وہ ہاتھوں کو جنبش دیے آزاد ہونے کی سعی کرتا ہے۔اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے خواب کاٹے جا رہے ہیں......... پھر ایک طویل وقفہ کے بعد اس کی آنکھوں میں خون کی جگہ طمانیت ابھر آتی ہے۔ہاتھ نوٹ کو جکڑے ہوئے ہیں۔کاٹنے والے اس کے قریب آتے ہیں۔ہاتھ کی تیسری انگلی سے اس کی پیشانی پر مارتے ہیں ٹھن ٹھن کی آواز باہر نکلتی ہے۔

منظر4: سائبان میں عورت بوئے گئے بیجوں کو پانی دے رہی ہے اس کے ہونٹوں پر ممتا مسکرا رہی ہے۔اچانک اس کا شوہر آتا ہے اور اس کی اس حرکت پر ڈانٹتا ہے۔بیوی سمجھاتی ہے پھل آئیں گے۔شوہر کے چہرے پر پہلے تو خوف پھر ایک ایسی مسکراہٹ ابھرتی ہے جو اصل معاملہ جان لینے کے بعد آتی ہے۔''جب تک پھل آئیں گے ہم کھاد بن جائیں گے۔''

منظر5: ایک آدمی اپنے بیگ سے آلہ نکالتا ہے اور اس کو درخت کے ساتھ چپکا دیتا ہے۔ایک ہرے رنگ کا مادہ درخت سے نکل کر زمین پر بہہ رہا ہے۔دوسرا آدمی چلاتا ہے۔''ارے درخت سوکھ جائے گا۔یہ تو کلوروفل ہے جو درخت کے ہر فعل کی نگرانی کرتا ہے وہ تو درخت کا ضمیر ہے اور''.........

''بند کرو بکواس، کیا میں زندہ نہیں ہوں۔'' پہلا آدمی جھنجھلاتا ہے......... درخت سوکھنے لگتا ہے۔ دوسرے آدمی کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ پھر پہلا آدمی پاس ہی رکھے ٹب کا ڈھکن کھولتا ہے۔ اس میں بالکل تازہ خون ہے۔ ٹب کو وہ درخت کے پیڑ پر انڈیل دیتا ہے، درخت توانا ہوتا جارہا ہے۔ صرف پتے سفید ہوگئے ہیں۔ دوسرے آدمی کو اپنی زندگی یاد آجاتی ہے اور وہ پہلے آدمی سے التجا آمیز لہجہ میں کہتا ہے ''مجھے بھی اس درخت کی مانند کردو۔''

منظر 6: تپتی ہوئی پرشور سڑک پر اچانک دو آنکھیں گرجاتی ہیں، پھر ہاتھ، پیر، ناک، کان حتیٰ کہ زبان گرجاتی ہے اور مچھلی کی طرح تڑپنے لگی ہے۔ 'بند کرو یہ حادثے'

منظر 7: ''کیا تمھیں یقین ہے کہ اب بھی اتنے عرصہ بعد امید وہاں ہوگی''۔ ہاں....... روشنی لاک اپ کمرے سے باہر کیسے نکل سکتی ہے۔ کھٹ قفل کھلنے کی آواز....... پھر کمرے میں بہ یک وقت دو آوازیں........ ''تم کہاں ہو''

منظر 8: ایک آدمی بڑبڑا کر بستر سے اٹھتا ہے۔ محبوبہ تشویش سے پوچھتی ہے'' کیا بچھو ہے۔'' محبوب تشویش بھرے انداز میں جواب دیتا ہے۔ ''منحوس خبریں ہیں۔''

منظر 9: اور وہ انھیں یقین دلا رہا ہے کہ Sea-Cucumber کا مائع نگلتے ہی وہ تمام حادثوں سے بچے رہیں گے۔ اس مائع کی قیمت وہ طلب کرتا ہے۔ وہ تمام اس کے پاس قیمت گروی رکھ دیتے ہیں اور مائع نگل جاتے ہیں۔ امتحان کے طور پر وہ ایک آدمی کا گلا کاٹتا ہے۔ دوسرے ہی لمحہ گلا نمودار ہوجاتا ہے۔ پھر سینہ توڑتا ہے۔ سینہ بھی دوسرے پل نمودار ہوجاتا ہے۔ تمام ہنسی خوشی چل دیتے ہیں مگر وہ آدمی جس پر ابھی دو تجربے کیے گئے تھے۔ اپنی روح پر زخم محسوس کرتا ہے پھر خوش ہوجاتا ہے کہ قیمت ہی کیا تھی محض ''محبت۔''

منظر 10: ایک لامحدود لانبی قینچی اپنے دونوں منہ کھولے مسلسل حرکت کررہی ہے۔

ہر منظر منہ میں سے گذر جاتا ہے اور ڈھیر ہو جاتا ہے مگر دوسرے ہی پل اٹھ کر اپنے ہمسائے زخمی منظر سے ہنسی خوشی مل رہا ہے۔ تمام منظر اس عظیم حادثے کو بھول کر لایعنی باتیں کرنے میں مگن ہیں۔ ان سب نے سوچ لیا ہے کہ قینچی ان کا مقدر ہے۔''

حلق بند ہو جاتا ہے۔ ذرات گم ہو جاتے ہیں اور میری آنکھ اس دروازہ کو لیے First Aid Box پر رک جاتی ہے۔ بس خالی ہو چکی ہے صرف میں اور وہ مسافر گم سم ہیں۔ وہ مسافر آہستہ سے اپنی سیٹ سے اٹھتا ہے میری اجازت سے میرے بازو بیٹھ جاتا ہے۔ 8 میل..... سر سے کوئی چیز گردش کرتی ہوئی آنکھوں کے راستے باہر نکلنے کی سعی کرتی ہے۔ میں اسے روکنے کے لیے مسافر سے پوچھتا ہوں، ''آپ کا نام۔'' مسافر کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرتے ہیں جیسے میں نے کوئی غیر متوقع اور غیر متعلق سوال کیا ہو۔ پھر وہ جذبات سے عاری لہجہ میں جواب دیتا ہے۔ ''ہم سب 8 ہیں۔'' ہمارا اب کوئی نام نہیں .... باہر چاندنی پھیل چکی ہے۔ مجھے ایک طرح سے یہ چاندنی غازہ دکھائی دیتی ہے جو زمین کے مسخ چہرے کو چھپانے کے لیے تھوپی گئی ہے۔ بس کو بریک لگ جاتی ہے اور مسافر بے چینی سے باہر نظر ڈالتا ہے۔ دو انسپکٹر داخل ہوتے ہیں اور مسافر کی تلاشی لینے لگتے ہیں، پھر میرے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا گیا ہے جب میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالی جاتی ہے تو میں کھڑکی سے نظریں ہٹائے چونک جاتا ہوں....... انسپکٹر کی آواز ابھرتی ہے ''وہ چیز مل گئی''

جیپ نہ جانے مجھے کہاں لیے جا رہی ہے۔ میں اتنا حیراں ہوں کہ اس طرف سے دھیان ہٹانے کے لیے پچھلے ریگ زار لمحوں میں خود کو تلاش کر رہا ہوں۔ ہاں میں 6 ہوں۔ 9 جو وہ تھی۔ 4 وہ تھا 3 جو وہ سب تھے ان دنوں جب مجھے چاندنی غازہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ میں نے اور 9 نے بہ ظاہر دوئی اور بہ باطن اکائی کے اس جذبہ کو 7 کی اساس پر 1 کی قوت کے

ساتھ اپنے اندر سمولیا ہے۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہمارا کوئی 5 نہیں ہے پھر بھی رفتار میں کمی نہیں ہوئی، اس رفتار کی راہ پر ہم لایعنی حرکتیں کرتے تھے اور بے تکی باتیں۔ سچ ہے کوئی عرفان لایعنی حرکتوں اور بے تکی باتوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

ایک دن ان سبھوں نے 2 کو ہم پر مسلط کرنا چاہا مگر رفتار بڑھتی گئی۔ جب رفتار بڑھتی ہے تو آدمی کی آنکھیں عموماً زمین پر کم ہی رہتی ہیں۔ پھر اگر ساتھ میں کسی 9 کا وجود ہو تو اور بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ اس نفسیات کو سبھوں نے محسوس کیا اور چپکے سے پل توڑ دیا۔ رفتار پل میں سسکتی رہی اور 8 منہ کھولے اس ٹوٹے پل میں اپنے انتظار کو ختم کر چکا تھا........ جیپ کے دھچکے مجھے پچھلے ریگ زار لمحوں سے نکال لاتے ہیں........ غازہ اتر چکا ہے۔ مجھے اب بھی اس بات کا قطعی علم نہیں ہے کہ آخر میری جیب سے وہ کون سی چیز برآمد ہوئی جس کی بنا پر مجھے قیدی بنایا گیا ہے، مجھے کوئی جواب نہیں ملتا۔ صرف 60 کا ہندسہ میرے اندر سے نکل کر اس زمین پر بکھرتا جا رہا ہے۔ ●●

مفلوج

(خورشید وحید کی یاد میں)

''یہ کیوں کر اور کیسے ہوا۔'' اس سارے عرصہ میں استاد سعادت علی کا سراپا ابھرتا' ڈوبتا' ڈولتا رہا تھا۔ گئی رات جب میں شہر کے پرشور نعروں سے خلاصی پا کر اپنی چھت پر پہنچا تو نسبتاً ملول اور واقعتاً افسردہ تھا۔ اماں نے خلاف توقع آج ہی چھت پر سونے سے منع کیا تھا ورنہ وہ ہر بار شبانہ کے منع کرنے پر میری حمایت کرتی آئی تھیں۔ میں ہمیشہ سے موسم گرما میں چھت پر سونے کا عادی رہا ہوں۔ کھلے میں' وسیع و عریض' لاکھوں تاروں سے بھرے آسمان کو تکتے ہوئے، اپنے آپ کے حقیر ہونے کی لذت کا احساس مجھ پر مدہوشی طاری کر دیتا ہے۔ مگر گذشتہ ایک دہے سے اس شہر پر جولائی اگست کے مہینوں میں زلزلے کے ہلکے سے جھٹکے محسوس کئے جا رہے تھے۔ اس لئے شبانہ اور بچے' بالخصوص جمال میرے چھت پر سونے کو میری ہٹ

دھری پر محمول کر رہے تھے۔

''میں نے کب اپنی من مانی کی ہے۔'' کرسی کے ہتھے پر مجھے اپنے ہاتھوں کی کپکپی محسوس ہوئی۔ آنگن میں تیز ہواؤں کے ساتھ بارش کے جھماکے اشوک کے پتوں پر تیز وار کر رہے تھے۔

''میں تمھارا داخلہ اگر یکلچر میں کرانا چاہتا تھا مگر تم نے سول انجینئرنگ میں میری مرضی کے خلاف ایڈمیشن لیا تو کیا میں نے اپنی چلائی۔ جواب دو جمال'' میں نے لرزتے ہوئے اس سے سوال کیا۔ وہ آنکھیں جھکائے واشنگ مشین پر اپنی شہادت کی انگلی کرید رہا تھا۔ اماں اور شبانہ اسے ایک ٹک گھور رہی تھیں۔

''میں ناظمہ کے انگریزی میڈیم اسکول میں داخلہ کے خلاف تھا۔ اور میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ نسرین خیر البنات مدرسہ کے ہوسٹل میں شریک ہو کر عالمہ کورس کی تکمیل کرے۔ مگر تم لوگوں نے کب میری چلنے دی؟'' میری آواز روہانسی ہوگئی۔

''اب بس بھی کر کمال'' اماں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

چھت پر پانی کی ٹنکی سے متصل سائے میں میرا بستر لگا دیا گیا تھا۔ آسمان میں نیم اندھا چاند اپنی چاندنی کا سیلاب شہر پر انڈیل رہا تھا۔ گذشتہ ایک ہفتہ سے جاری مناظرہ کی آوازیں مدھم ہو چکی تھیں۔ شہر کے لوگ اپنی اپنی گلیوں میں اس مناظرہ پر تبصروں میں مشغول نظر آتے تھے۔ ایک گروہ 'شرع' کی تلقین میں لگا تھا تو دوسرا گروہ 'طریق' کو اصل مقصد حیات قرار دینے پر بہ ضد تھا۔ دونوں گروہ ایک دوسرے کے 'مرکز' سے ہٹ جانے کا شکوہ کر رہے تھے۔ چھت ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا غالباً وہ دونوں گروہ سلاخوں سے لیس اپنے اپنے محبس میں محفوظ ہیں۔

ڈرائنگ ہال کی چوکور سلاخ دار کھڑکی میں انسانی سر کے سایے نے مجھے اسٹڈی روم میں کتاب چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ میں جان گیا تھا کہ تمنا سلطانہ کھڑکی میں آئی ہے۔ گھر میں اس وقت میں تنہا تھا۔ اماں' بچے اور شبانہ اپنی والدہ کی خبر گیری کے لیے گئے ہوئے تھے۔ ان کا مکان کچا تھا۔ شہر میں تاریخ میں پہلی بار گذشتہ شب کے آخری پہر زلزلہ کا ہلکا جھٹکا محسوس کیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے لوگوں میں سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ میں کرسی سے اٹھا۔ اپنے نوٹس کی تیاری کر چکا تھا۔ ڈرائنگ ہال میں بے نیازی کا پوز کرتا ہوا داخل ہوا۔

'سر' اشتعال پید کرنے والی آواز تمنا کی تھی۔ میں نے چونکتے ہوئے چوکور کھڑکی کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ سورج کی روشنی کا انعکاس اب بدن پر تھا۔

''سر۔ یہ زلزلے کیوں آتے ہیں۔'' وہ تشویش زدہ تھی۔

''زمین کے اندر ہی اندر' بہت زیادہ گہرائی میں فالج کا حملہ ہوتا ہے'' مجھے اپنی علمیت کا رعب جمانے کے لیے کوئی اور جواب نہیں سوجھا۔ میں نے اس کی بولتی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''ہاں زمین کو بھی فالج ہوتا ہے۔''

''مگر کیسے'' اس نے پھر تشویش سے پوچھا۔

میں نے اور قریب ہوتے ہوئے اپنا بدن دیوار سے ٹکا دیا اور ایک نیم بوسہ اس کی بولتی ہوئی آنکھوں پر رکھ دیا۔ اس کے پپوٹے تھرتھرا رہے تھے اور میرے دونوں ہاتھوں کی تین کپکپاتی انگلیاں اس کے مرتعش سینہ میں دھنستی جا رہی تھیں۔

''ایسے'' میں نے دیوار سے پیچھے ہٹتے ہوئے جواب دیا۔

''ذرا اور وضاحت سے سمجھایئے'' تمنا کی آواز رندھ گئی تھی۔

''دیکھو جب زمین کے اندر ہی اندر کسی ایک نقطے پر فاسد مادوں کا اجتماع ہو جاتا

ہے تب زمین ہی کا کوئی ایک متاثرہ مرکز، ان فاسد مادوں کو پوری شدت سے آگے دھکیل دیتا ہے جس کے باعث زمین میں کپکپاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ یہی زلزلہ ہے۔ اس عمل میں شدت جتنی زیادہ ہوگی زلزلہ اسی مناسبت سے واقع ہوگا اور زلزلے کا تھم جانا زمین کا مرکزی حصہ مفلوج ہو جانا ہے۔'' میں نے نیم غنودہ بوریت' سے جواب دیا۔

پانی کی ٹنکی پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے میں نے نیم غنودہ شہر پر نظریں دوڑاتے ہوئے اُفق کے اس پار کچھ کھوجنے کی کوشش کی مگر دور تک اونچی اونچی گنبدوں اور درختوں کے جھنڈ کے سوا کچھ اور بھائی نہیں دیا۔ تھک ہار کر میری نظریں خود بہ خود پڑوس کے نیم روشن آنگن پر جم گئیں۔ مگر اب وہاں کیا تھا۔ تمنا کی رخصتی کو قریب ایک دہا گذر گیا تھا...... اس عرصے میں وہ کبھی دکھائی نہیں دی۔ بستر پر نیم وا آنکھوں سے آسمان تکتے ہوئے مجھے خیال گذرا کہ ان دنوں مجھے روحانی محبت کتنی فضول اور بے معنی لگتی تھی.........

''فالج اندر ہی اندر پلتا رہتا ہے۔ وہ ہر شئے میں سرایت کرتا ہے۔''

''کس نے کہا؟'' آنکھ ملتے ہوئے میں نے دیکھا۔ اب بھی مناسب اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔ فضا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ فجر کا وقت نکل چکا تھا۔ صبح کی ابتدائی ساعتوں میں ہلکی سی پژمردگی تھی۔ گناہوں کی لذت سے تہی عبادت میں کس قدر بے کیفی ہوتی ہے۔ میں اٹھا۔ بستر سے تھوڑے فاصلے پر حسب عادت اور ہدایت پانی کا لوٹا اور گلاس رکھا ہوا تھا۔ پانی پر پانچ مرتبہ درود دم کیا اور پھونک ماری۔ مطالعہ نے کہا۔ قرآن سے پہلے درود کا ورد کیوں کیا؟ میرے پاس اس کا کوئی دل لگتا جواب نہ تھا۔ پھر میں نے حسب یقین قرآن کی ایک سورت پڑھی جس میں آدمی کو سب سے افضل تخلیق ہونے کی بشارت دی گئی ہے پڑھی، اور پانی پر پھونک ماری۔ مطالعہ نے کہا: اب یہ شافی عمل ہے۔ میرے دل کو اطمینان ہوا۔ پانی پیتے ہوئے میں نے

سارے وجود کو شرابور محسوس کیا۔ یہ آبِ شفا ہے۔ دور مسجد کے میناروں پر بے ریا روشنی جمی ہوئی تھی اور ہارن کی آوازوں پر لگا شہر جاگ رہا ہے۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے منی پھاٹک کھولا اور دالان میں پاؤں رکھے۔ اماں اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے میری طرف متوجہ ہوئیں۔ ایک لمحہ کے لیے میرے دل میں ایک ان جانے خوف کا احساس جاگا۔ آگے بڑھ کر میں نے اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔

''اماں جان بس آپ مجھے معاف کیجیے۔''

میرے سر میں انگلیاں پھیرتے ہوئے انھوں نے کہا'' ایسا کیوں کہتے ہو میرے بچے۔ روز روز''

میں کیا جواب دیتا مگر میں کہنا چاہتا تھا: ''ماں میں ہر محاذ پر ناکام ہوا ہوں کیوں کہ میں کسی معاملہ میں ایمان دار نہیں رہا۔ میں نہ دنیا کا وفادار رہا نہ ہی عاقبت سے بہرہ ور ہوا۔'' میں کچھ کہہ ہی نہیں سکا۔ کسمساتا ہوا اُٹھا اور ڈرائنگ ہال میں داخل ہوا۔ چوکور کھڑکی پر نظر اٹھی۔ قریب ہی جمال بے سدھ سویا ہوا تھا۔ شاید وہ رات دیر گئے شرعٔ کے اجتماع سے واپس لوٹا تھا۔ میں نے اس کی رضائی ٹھیک کی۔ اپنی بے وطن بیٹی کے لیے ایک ہوک سی اٹھی اور اپنی ہم وطن بیٹی کو یاد کیا۔ حالاں کہ دونوں کی شادیوں کے بعد کس قدر فراغت کا احساس ہوا تھا'' آخر یہ لڑکیاں ہمیشہ کے لیے کیوں جدا ہو جاتی ہیں۔'' میرے منہ سے نکلا۔

''یہ ہم دردی کے پردے میں کون سا نیا پینترہ سوجھا ہے'' شبانہ نے اسٹڈی روم سے نکلتے ہوئے جواب دیا۔

''اے بے عقل عورت میں اپنی بچیوں کی بات کر رہا ہوں۔ تمھاری نہیں۔''

''کیا؟'' شبانہ نے تشنج بھرے انداز سے پوچھا'' کیا نسرین یا ناظمہ کو کچھ ہوا ہے؟ آپ اس

قدر سنگ دل کیوں ہیں۔ کیوں نہیں بتایا۔ مجھے جگایا ہوتا........ وہ روہانسی ہوگئی۔

''نہیں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بس ان کی یاد آ گئی اور یادوں پر کس کا بس ہے؟''

''مگر یہ تو آپ کے بس میں ہے کہ جلد گھر لوٹیں۔ کس مناظرہ میں گئے تھے؟''

''مجھے کسی مناظرہ کی کوئی حاجت ہے نہ اس سے دلچسپی''

''ہاں مجھے معلوم ہے۔ آپ کی دلچسپی تو اس جھکی........''

''شبانہ'' میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا ''تمنا اور انعام کے موقف الگ الگ ہیں''

''کیا مطلب؟'' اس نے درشتگی دکھائی۔

''مطلب........ کہ........ یوں سمجھو دو کنگن!!''

''اب یہ کنگن کہاں سے آئے''

''یہ وہ کنگن ہیں، جس کی امید میں ہر آدمی جی رہا ہے۔''

''آدمی یا عورت!!'' بیوی نے تمسخر بھرے انداز میں کہا

''میں تمھارے کنگنوں کی نہیں، ان کا تحفہ دیے بغیر نہیں مروں گا اور اگر مر بھی گیا تو یہ تمھیں مل جائیں گے''........ شبانہ نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہاتھ کو ہٹاتے ہوئے میں نے سلسلہ جاری رکھا ''جمال سے اپنی وصیت کا اظہار کر دیا ہے۔''

''پھر کون سے کنگن؟'' شبانہ کے لہجہ میں تشویش تھی''

''تمنا اور انعام کا اپنا اپنا موقف ہے''

''یہ آخر ہیں کون؟''

''تمنا سے تم واقف نہیں ہو اور انعام سے میری واقفیت نہیں''

''اب شروع ہو گیا جھکی پن........ کہیں جانا ہے''

''ہاں مگر جانے سے پہلے تمھیں یہ بات بتانا چاہتا ہوں''

''کون سی''

''یہ کیوں کر اور کیسے ہوا''

''کیا ہوا''

''دراصل........''میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا''کل رات استاد سعادت علی پر فالج کا شدید حملہ ہوا ہے۔اسی لیے رات آنے میں تاخیر ہوئی۔''میں نے اسٹڈی جاتے ہوئے کن انکھیوں سے جمال کی طرف دیکھا۔

''اب کہاں گئی اس جھکی کی حکمت''شبانہ نے تقریباً قہقہہ لگاتے ہوئے اسٹڈی روم میں داخل ہو کر کہا''اپنی اماں کا علاج کراتے ہیں نا آپ اُس سے..........جو خود فالج سے بچ نہیں سکا......... کاہے کا حکیم اور کاہے کا مرشد؟ اللہ کی جانب سے اچھا انعام ملا ہے اسے''.........

''انعام؟''میں چونکتے ہوئے بڑبڑایا۔

''ہاں انعام''شبانہ نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا''میری امی کہتی ہیں کہ اس جھکی نے اپنی بوڑھی حواس باختہ ماں کو آخری دنوں میں بہت ستایا تھا۔''

''بکواس ہے''میری آواز میں خوف کی لرزش تھی۔

''امی کہتی ہیں کہ اس نے اپنی خلافت نشینی کی محفل میں'رات جب اس کی بوڑھی ماں اپنے گھر میں چراغاں دیکھ کر محفل میں آئیں تو اس جھکی نے ان کو خوب جھڑکیاں دیں اور بھری محفل سے انھیں گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا''شبانہ نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

میں کچھ جواب نہیں دے سکا۔اس رات کی ساری باتیں میری نظروں میں گھوم

گئیں۔

''دنیا اور عاقبت تو دو کنگن ہیں'' انھوں نے گاؤ تکیہ سے ٹیک لگاتے ہوئے مجھے جواب دیا۔

''مگر یہ تو ہر آدمی کا مقدر ہے قبلہ''

''لیکن تمنا اور انعام ہر کسی کا مقدر نہیں'' اُن کے لہجہ میں استہزا تھا۔

''پھر میرا مقدر کیا ہے''

''صرف سالک ہی انعام کا حق دار ہے'' انھوں نے میرا سوال اَن سنا کر دیا۔

''ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ....''

''خاموش......... تو ابھی تمنا میں ہے''

میں نے کنکھیوں سے شبانہ کی طرف دیکھا۔ وہ اب اماں کے ساتھ مشغول تھی۔ کھڑکیوں سے دھیمی روشنی سرک رہی تھی۔ جمال ابھی تک سویا ہوا تھا۔ میں نے جلدی جلدی ضروری کام نپٹائے........ لباس تبدیل کیا۔ آج تعطیل بھی تھی، دہلیز کے قریب میں نے شبانہ کو آواز دی۔

''دیکھو ذرا اماں کا خیال رکھنا'' میں نے رک رک کر کہا۔

''کیوں میری خدمت میں کوئی کمی دیکھی ہے؟''

''نہیں''

''کیا اماں نے آپ سے کوئی شکایت کی ہے؟''

''وہ کیوں بھلا تمھاری شکایت کرنے لگیں۔''

''عقل مند بیٹے کی ہوشیار ماں ہیں نا وہ.........''

''دیکھو........ تم کوشاید ان کی ضرورت نہ ہومگر میرے لیے.........''

''مجھے بھی اپنی عاقبت کا خیال ہے۔''

''انھیں بادام کا حریرہ دے دینا۔''

''دے چکی ہوں........ اور کچھ.........''

میں باہر نکل آیا۔ بازار میں روز ہی کی طرح 'مرکز' کی بازیافت اور اس کی تفسیر پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میں سب سے نظریں چراتے آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

''جناب کمال صاحب........''

''جی''میں رک گیا۔

''کیا قبلہ کے درشن کے لیے جا رہے ہیں''احتشام کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ پدر نامدار والد بزرگوار کو بہ غرض آزمودہ علاج' راجہ پور کے ڈھل مندر کے پجاری کے ہاں گیرو چٹانے کے لیے جایا جا رہا ہے''لفظوں کو چباتے ہوئے اس نے آنکھیں گھمائیں۔

میں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ ایک طویل قہقہہ میرا پیچھا کرتا رہا۔ سعادت منزل کے صحن میں نیم کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ ارادت علی سامان باندھنے میں لگا تھا۔ اس نے انگلیوں کو جھٹکتے ہوئے میرے سلام کا جواب دیا۔ میں اندر کمرہ میں داخل ہوا اور ٹھٹھک گیا۔ استاد سعادت علی شاہ ایک ہی رات میں بجھ سے گئے تھے۔ جسم کا بایاں حصہ پوری طرح مفلوج ہو چکا تھا۔ انھوں نے مجھے دیکھ کر کچھ بات کرنے کی کوشش کی مگر لکنت اور بے زبانی ان پر مسلط ہو چکی تھی۔ وہ زبان جس سے معرفت کے چشمے ابلتے تھے آج خشک ہو گئی تھی۔ وہ بار بار اپنی

کلائیوں میں کچھ کھوجنے کی کوشش کررہے تھے.........

''یہ کیسا انعام ہے؟'' یہ سوال میرے ذہن پر مستولی تھا......... روانگی تک میں رکا رہا۔ پتہ نہیں کب تک.........

شام، شہر کے مرکزی چوراہے پر دنیا اور عاقبت کو گشت لگاتے دیکھ کر میں گھر کی طرف لوٹا۔ پھاٹک کھول کر گھر کے اندر خاموشی سے داخل ہوا۔ جمال کی زورزور سے چیخنے کی آواز آرہی تھی......... اسٹڈی میں داخل ہوتے ہوئے مجھے چوکور کھڑکی میں کسی سائے کے سرکنے کا احساس ہوا۔ میں اپنے آپ کو پلنگ پر ڈھیر کرنا ہی چاہ رہا تھا کہ جمال ہانپتے ہوئے اندر داخل ہوا۔

''ابا آپ اسے میری گستاخی نہ خیال کریں مگر یہ میری شرعی ذمہ داری بنتی ہے کہ میں آپ کو آپ کے مسلک کی گم رہی کے بارے میں بتادوں۔ خدا کے لیے'' .... اچانک جمال لڑکھڑایا میں نے جمال کے وجود کو تھاما......... اس کا دایاں حصہ پوری طرح اکڑ گیا تھا۔ اسے پلنگ پر لٹاتے ہوئے میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔

''اماں''۔ شبانہ اور اماں گھبراتی لڑکھڑاتی کمرے میں داخل ہوئیں۔ جمال کی آنکھوں سے ویرانی ٹپک رہی تھی۔ ●●

تقیہ بردار

گویا سورج طلوع ہو رہا ہے کہ غروب لیکن بانس کا یہ طویل، بے کراں، پر اسرار گھنا جنگل بشارت کے عین عین تھا اور انھوں نے کہا تھا: سانس کی آتی جاتی لہروں کے بیچ ایک انتہائی خفیف سا وقفہ ہوتا ہے، یہ حبس ہے۔ یہیں لا ہے۔ یہیں عدم ہے، اسی کا نام وجوبِ وجود ہے اور یہی کلہم انکشاف اسرارِ ذات ہے۔

مگر اس کا یہاں پہنچ جانا حکم تھا کہ بشارت یا محض واہمہ!

گہرے سبزی مائل فنگس زدہ پانی میں بانس کا لانبا ڈنڈا ہلکورے لے رہا تھا۔ یقیناً یہ باؤلی بہت قدیم ہے۔ میں نے بہت بہت پہلے سن رکھا تھا کہ شب شہید اعظم ایک روشن تعزیہ باؤلی کی تہہ سے ابھرتا ہے اور غالباً تاریک آب اور میلی کائی کو پھاڑتے ہوئے اس بانس میں حلقوم ہو جاتا ہے........ یہ روایتی واہمہ آج بھی میرے لیے سحر انگیز ہے۔ گو اس کا مشاہدہ

کاروبار حوادث نے کرنے نہیں دیا۔

رضوان کو بھی یہیں گھر لینا تھا؟

اب بھی سارے کا سارا ماحول کہر آلود تھا۔ بارِ امانت سے ملحقہ پہاڑ، ازلی گوابان تسبیح خواں پیپل کے درخت......... سب کے سب دھند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں ویسے سردی ہو یا بارش سحر گزیدہ ہوں........ اسی رات رضوان نے رخصت ہوتے ہوئے پھر سے اسی وقت وہاں چلنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ ارادہ موسم سے بے نیاز ہے...... یوں بھی اس رات تعلیم گاہ میں کچھ زیادہ ہی سلوک نوشی رہی تھی، کمرے میں کوئی بلب تو تھا نہیں اس لیے تھرتھراتے چراغوں کی لوؤں اور منتشر مراقبی دھوئیں میں چہرے، باتیں اور شاید منزلیں گمان ہی گمان تھیں۔

''اپنے آپ کو دیکھنے کے لیے اپنے آپ میں نہ رہو۔''

میں نے ظاہر علی شاہ کو تب غور سے دیکھا، وہ اپنے آپ میں نہ تھے۔

باہر کی تنگ و تیرہ ہواؤں کو تنہا تنگ چوکور کھڑکی روکے ہوئے تھی۔ میں ہلکے ہلکے نرم ذائقوں کا وارفتہ، طویل طویل نشستوں کا رسیا اور غم گزیدہ آوازوں کا شائق رہا ہوں مگر یہاں تعلیم گاہ میں .... سبھی جانے کتنے اطمینان کے ساتھ تلخ ترین ذائقہ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''لے کہ تو بہت دنوں تک سوتا رہا ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ گردش مدام پیالہ میں چراغ کی لویں لپٹی ہوئی ہیں اور نیم اندھیرے کے پیچھے تمام سرخ آنکھیں مجھ اجنبی کو گھور رہی ہیں۔ رضوان کے ٹھوکے پر میں نے بہ دقت تمام چسکی لی۔ تلخ ترین ذائقہ کے ساتھ دور کہیں ڈھول کی آواز کا گمان ہوا......

جنگل۔

''تو جہاں جنگل نہیں وہاں عشق عدم ہے۔ معشوق اپنی زلف کھولے، درندوں سے بے نیاز عاشق کے وجود سے منکر کہ وہ خود ہی عاشق ہے۔ عشق کے سائے میں سوتا ہے کہ یہی اصل بیداری ہے۔ راہی، تو جو عاشق ہے، تو جو درندوں سے خوف زدہ ہے کہ تجھ پر جنگل، اصل حقیقت ہے، معشوق کی جانب گامزن ہو۔''

چلم سے نکلتا ہوا دھواں، تعلیم گاہ کے جاریہ سبق کا ابتدائیہ تھا۔

.... ختم....... تو سب کچھ ختم ہو گیا۔ تم کو یاد ہے........ کہ یہ آگ کب سلگی تھی۔ مگر........ مگر تم تو مجھ سے منکر اور درندوں سے بے نیاز ہو۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے چوں کہ میں اپنے آپ کا منکر اور درندوں سے بے نیاز نہیں ہوں کہ اس قسم کے وقوعہ میں بہ ظاہر کوئی اسرار نہیں ہوتا۔ الوداع ہوتی ہوئی سرد ترین صبح، ٹرین کی بے جان، سیاہ سخت کھڑکی سے تمھارا کنگن میرے ہاتھوں سے شاید اس لیے گر گیا تھا کہ ہر ابتداء اپنے خاتمہ کی اولین گواہ ہوتی ہے۔ خیالات خشوع وخضوع کے حصار کو توڑتے رہے تھے۔

مگر یہاں میری آواز سننے والا کون تھا؟

لانبے لانبے موٹے پتھریلے ستون، جن پر لاکھوں آوازیں لپٹی ہوئی ہیں مگر کوئی آواز منبر بوس نہیں ہوتی۔

دور بہت دور، مسجد کے اونچے مینار سے اللہ اکبر کی آواز خفیف سی ہوتی جا رہی تھی۔ اطراف گھنے بے کراں لانبے لانبے درختوں کی حد بندی کے بیچ، ایک ٹوٹی ہوئی باولی کے چبوترے پر میری سانسیں پھول رہی تھیں، اس وحشت زدگی میں کہاں نکل آیا تھا۔ خواب پر کس کا بس ہے۔ لیکن کونوں، کھدروں، شیشے کی دیواروں اور کتابوں کی الماریوں میں چھپے منتظر

بیدار نقوش مجھ پر ٹوٹ پڑے۔تب مجھ پر سراسیمہ کر دینے والی وحشت طاری ہوگئی.......
بھاگتا..........یہاں آ پہنچا۔

''بیٹے! سانس کی آتی جاتی لہروں کے بیچ جینے والے نفوس ذات اصغر ہیں۔تم نے آج اپنے گناہوں اور لاعلمی کو چرانے کا تجربہ کیا ہے۔اٹھو اور اس خفیف سے وقفہ کی طرف گامزن ہو جاؤ جہاں حبس ہے۔''

پلٹا تو کنگھی کرتی انگلیاں غائب ہو چکی تھیں۔میرا یہاں آ جانا حکم تھا کہ بشارت یا محض واہمہ، باؤلی پر جھکا تو میری وحشت زدگی کے آئینہ میں ایک نیا چہرہ ابھر رہا تھا۔صاف شفاف پانی کا ویرانہ........

سامنے ،ہلکا سبزی مائل پانی حوض میں ساکت تھا،آدمی رخصت ہو چکے تھے اور منڈیروں پر چوکنا کوے کائیں کائیں کر رہے تھے۔

مہمان!

ساکت پانی میں انجیر کا سوکھا پتا گرا تو مجھے خیال آیا کہ متوقع دیدار کی کہانی میں شامل ہونے کے لیے بالآخر سورج نیا پیام لیے آیا ہے۔مجبور سورج، مجبور دنیا اور مجبور آدمی پر طلوع ہوتا ہوا۔

''چلنا ہی چاہئے............راہی!''

خ:و:ن:ی:ا:ل:ا:و:ہ

یہ کوئی محلہ ہے یا جنگل؟ بندروں ،لومڑیوں ،ریچھوں اور بیلوں کے ریوڑ سے بچتا بچاتا اشارہ گاہ تک پہنچا۔سامنے دروازہ پر سورج کی زرد کرنوں میں سفید زنجیر سے بندھا کالا کتا، استقبالیہ مسکراہٹ لیے، درندوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

''تو کیا میں بھی؟'' ایک سنسنی خیز تحیر ساری اداسی پر غالب ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

''مرشد! کتا، بیل کا تعاقب کیوں کرتا ہے۔'' تحیر حکایت جاریہ کا لازمی عنصر تھا۔ رضوان نے سوچا اور سوال کیا۔

''پردہ!''

''فہم نے مجھے چکا چوند کیا ہے اس لیے تجلی کا محتاج ہوں۔'' رضوان کے لہجے میں مزید استفسار تھا......... مولوی ذکا اللہ نے اس بار چلم پینے سے بھی انکار کیا۔ ظاہر علی شاہ نے انھیں گھور کر دیکھا۔ چوکور کھڑکی سے چاندنی کی کرنیں تعلیم گاہ کے وسط تک چلی آئی تھیں۔ کالے رومال سے اپنے چہرے کا گمانی پسینہ پونچھتے ہوئے مولوی ذکا اللہ نے رضوان کو مخاطب کرتے ہوئے جواب دیا۔

''حقیقت کے باب میں، کسان کے پاس اس کے اپنے بیج ہیں اور اس سے ملحق اس کی اپنی زمین۔ بیج بہ باطن عین پودا ہے اور پودا عین بہ باطن بیج ہے۔ سفر کے باب میں کسان اپنے بیج اور خود پر مشتبہ ہوا، اور شبہ عین ابلیس ہے۔ سن لو کہ ابلیس صرف جگہیں بدلتا ہے سو اس نے سواری بدلی۔ اب کسان کی جگہ، بیل کی پشت پر وہ سوار ہے اور نادان کسان کہن آلود زمین پر اپنا ہل بیل سے کھینچتا ہے اور نہیں جانتا کہ فصل کے اس پار عدم مسکراتا ہے۔''

''اور کتا'' .... میں نے پوچھا۔

''کتا عین باطن بیل ہے کہ دم سے خارج ہوتے ہوئے اشاروں پر وارفتہ ہے اور تعاقب اس کا مقدر ہے گویا بیل ظل ہے آدمی کا کہ اسے سبھی، اس کی ازل سے ابد تک جاری رہنے والی عظیم الشان جدوجہد کا نام دیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ جدوجہد آدمی کے لیے نہیں کتے کے لیے ہے اور کتا گلیوں سے نکلتا ہے تو بازاروں کا تعاقب کرتا ہوا دربار وں پر قابض

ہونے کا متمنی ہے کہ یہ بھی اس کا مقدر ہے........ افسوس، وجود کی سعی سلوک عدم بے حقیقت ہے۔''

''شاہ........ صاحب........!'' رضوان نے مجھے ٹھوکا دیا۔ مگر میں اب پوری طرح اپنے آپ میں تھا۔

''تو کیا موصوف ہے کہ وصف''

ظاہر علی شاہ نے کش لے کر اب کی بار رضوان کی جانب چلم بڑھاتے ہوئے کمرہ میں پھیلی دھوئیں کی چادر کے اس پار ہم سب کو دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

''وجود کے ماسوا ہر شئے وصف ہے اور بیل ظل نہیں، پردہ ہے وجود کا۔''

''پردہ!''

.... میں نے مرغیوں اور بلیوں کی پرواہ نہیں کی اور انھیں ہٹاتا ہوا دروازہ کے اندر داخل ہوا باہر دستخطی رسمیات کے بعد درندے ڈکاریں اگل رہے تھے۔ گو سیاہ کتے کا خوف اور اندیشہ میرے پورے حواس سپردگی پر حکمراں تھا کہ کب وہ اپنی سفید زنجیر الگ کیے مجھ پر چھا جائے مگر پھر بھی۔ میں........ میں تمھیں آخری بار دیکھنا چاہتا تھا۔ کارِ جہاں دراز ہے نا۔ روشن دان سے سورج کی مدھم کرنیں کمرے کے ایک محدود حصہ پر غالب تھیں اور تم۔ تم گلابی پردوں کے اندر، سرخ لباس میں ملبوس، ہلکی سبز روشنی کے سایہ میں، اپنے سیاہ بھورے بال کھولے باہر کی دستخطوں سے بے نیاز، میرے وجود سے منکر، اپنے گھٹنوں میں منہ چھپائے، تم........ تم کہ سوئی تھیں، جاگ رہی تھیں، رو رہی تھیں یا........ با مسرت آگیں خوابوں میں کھوئی ہوئی تھیں........ ایک زمانہ گزر گیا۔

پتہ ہی نہیں چلتا کہ کتنا زمانہ گزر گیا۔ سورج گویا طلوع ہو رہا ہے کہ غروب۔ بانس

کے اس طویل لامتناہی جنگل میں درندوں سے لڑتی، بھاگتی، لہولہان ہوتی ہوئی جدوجہد کا نام رات ہے اور خود کو سعی سراب کے لیے تیار کرنے کا نام صبح۔ تم نہ جانے کس درخت کے نیچے، اپنے سیاہ بھورے بال کھولے، درندوں سے بے نیاز، مجھ سے منکر سو رہی ہو کہ تمھارے لیے یہی اصل بیداری ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے یہ بانس کے اونچے اونچے درخت، خوف ناک درندے، گمان آلود سورج، میں اور میری سعی سلوک وغیر سلوک اور۔ اور تم، سب ایک ہی حقیقت کے مختلف رخ ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ مجھے اس کائی پر لہراتے ڈنڈے کا سحر یہ ہول دلاتا ہے کہ کہیں یہ سب کچھ میرا وہم تو نہیں ہے اور حقیقت میں کوئی رُخ نہیں ہے صرف ایک ہی سمت ہے۔ اپنے پلٹنے کا نام دوسری سمت ہے۔

''بیل نے مجھے کس قدر زخمی کر دیا ہے۔!''

اور وہ سمت......... اور یہ سمت۔ تقیہ گیر جنگل بے کراں ہے اور انھوں نے کہا تھا۔

''سانس کی آتی جاتی لہروں کے بیچ ایک انتہائی خفیف سا وقفہ ہوتا ہے۔ یہ حبس ہے اور یہ......... یہ جنگل ہے۔'' ●●

جے سی بی

''اچھا بابا۔جلد پہنچ رہا ہوں.......ہاں کوچنگ ختم کردی ہے...... ٹھیک ہے۔''

موبائل تپائی پر رکھا اور دیوار گھڑی پر نظر ڈالی......وہ سب میری طرف تاک رہے تھے۔ امکانی پسینہ پونچھتے ہوئے میں نے سوال کیا:

'ریاض اب کتنا پورشن باقی رہ گیا ہے۔'

'چار پوئم، تین پروز اور دو نان ڈیٹیلڈ..... گرامر سر،'

'تم لوگوں کے ایکزام کب سے ہیں۔'

'مارچ/اپریل میں ہوں گے سر' ریاض نے جواب دیا۔'

'اب تو نومبر چل رہا ہے........ کافی وقت ہے۔ پرسوں تک میں The Necklace ختم کردوں گا۔کل تم لوگوں کو چھٹی ہوگی۔ میں نے اطمینان بھرے لہجہ میں

بات جاری رکھی، اب مجھے نکلنا ہے......‘

الگنی پر پڑے پردہ کو ہٹا کر میں کمرے کے دوسرے حصہ میں پہنچا۔ وہ سب ایک ایک کمرہ سے نکل گئے۔ لباس تبدیل کیا۔ چہرے پر تھوڑی ردّوبدل کردی اور پردہ ہٹایا۔ نفیسہ کی موجودگی پر چونک گیا۔

’کیوں؟ تم گئی نہیں۔‘

’آپ نے کتاب دینے کو کہا تھا۔ مجھے دو دن کے اندر Synopsis داخل کرنا ہے۔ سر نے وارننگ دی ہے، اُس کے لہجہ میں تشویش تھی۔

’اور نہ داخل کرنے پر Internal Marks کاٹنے کی بابت کہا ہوگا، کتابیں ٹٹولتے ہوئے میں نے اُس سے استفسار کیا۔’ کچھ پڑھاتے بھی ہیں وہ‘

’بہت سمجھاتے ہیں وہ‘ اُس نے ’وہ‘ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

’اور اپنے تجربات، واقعات اور کارنامے بھی خوب بیان کرتے ہوں گے؟‘

’بہت سر.........اور اُنھوں نے اُردو اسٹوڈنٹ کے لیے ٹور بھی چاک آوٹ کیا ہے۔‘

’پھر تو تمھاری معلومات میں اور اضافہ ہوگا‘ دورانِ گفتگو اُس کی مطلوبہ کتاب مل گئی تھی۔ میں نے اُسے اُس کے حوالہ کرتے ہوئے کہا’ یہ کتاب اُن کے پاس نہیں ہے؟‘

’اُنھوں نے بتایا تھا کہ وہ اُسے اپنے ذخیرہ کتب میں تلاش کریں گے۔ تاہم اُنھوں نے اُن کی دوسری کتاب بالِ جبریل، عنایت کی۔‘

’بہتر یہی ہے کہ تم اپنی کورس کی کتاب ’بانگ درا‘ میں ٹھکی رہو اور ’بالِ جبریل‘ میں مت اُلجھو۔‘

'کیا وہ میرے Synopsis کے لیے مددگار ثابت نہیں ہوگی؟'

'اچھا........ مجھے فوری نکلنا ہے...... پھر بھی' میں آگے بڑھ آیا....... قفل ڈالتے ہوئے میں نے دیکھا پڑوس کے مکان کی دیوار سے سٹ کر دس پندرہ سؤر سو رہے تھے......... وہ تو میرے اسٹوڈنٹ کی مہربانی تھی کہ اُنھوں نے میرے کمرہ کی دیوار سے ببول کے کانٹے بچھا دیے تھے ورنہ مجھے بھی روز اس کا نظارہ کرنا ہوتا...... حالاں کہ یہ شہر کا نیا علاقہ تھا۔ میں نے اپنا کمرہ شہر کے آخری کنارے، لبِ سڑک حاصل کیا تھا۔ ابتدا میں ایک تو کمرہ آسانی سے دستیاب ہوگیا تھا دوسرے یہاں کوچنگ کے لیے طلبا کی کثیر تعداد مل گئی تھی۔ آطراف میں چار پانچ کالجس چل رہے تھے۔ شہر کے اس کنارے نو دولیتے اور تعلیم یافتہ خاندان آباد ہوگئے تھے۔ میرے یہاں کوچنگ کے چار Batches چلا کرتے تھے۔ اس طرح میرے .M.E ہونے کا کچھ نہ کچھ مداوا ہوگیا تھا اور میں اپنے بھائی بھابھی پر بوجھ نہیں بنا تھا........ میں کافی جگہوں پر انٹرویو دے چکا تھا مگر ہر بار نا معلوم وجوہات کی بنا پر نظر انداز کیا جاتا رہا۔ باہر جانے سے مجھے چڑ تھی........ ہر جگہ خلفشار اور بدامنی..... یہاں سکون تو تھا....... مگر اِدھر اُدھر سؤروں نے اس علاقے کو اپنی چیخ و پکار سے پراگندہ کر دیا تھا...... سڑک کے اس طرف بوڑھا برگد کا لمبا چوڑا درخت اپنی جٹائیں زمین پر ٹکائے کھڑا تھا۔ یہاں سؤر نہیں آسکتے تھے کیوں کہ برگد کے آطراف دن رات لوگوں کا اجتماع ہوتا رہتا۔ آطراف کے دیہاتوں کے لوگ اپنا اپنا سامان زمین پر رکھے، ستانے کے لیے رُکے رہتے اور گپ شپ کیا کرتے۔ ہر کسی کے لیے برگد کا درخت پناہ گاہ بن گیا تھا۔ ایسے میں سؤروں کا یہاں رُکنا محال تھا۔

میرے بڑے بھائی نے مجھے بتایا کہ کوئی پچیس تیس سال اُدھر کی بات ہوگی، چاہے

مولوی ہو کہ قاضی، پنڈت ہو کہ پجاری، عالم کہ جاہل، امیر کہ غریب...... تمام شہر کا یہ وطیرہ رہا کہ بچوں کو اپنے گھروں میں فطری حاجت رفع کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے صبح وشام، سردی ہو کہ دھوپ یا بارش، بچے اپنی فطری ضرورتوں کو اپنے گھر کے قریب کی نالیوں میں رفع کرتے اور گھر کے بڑے اپنے اپنے مکانوں میں اس علّت سے فارغ ہوتے۔ اپنے گھروں میں اس کا اچھا خاصا انتظام تھا۔ ہر گھر میں اُن کے آباواجداد نے اس غرض کے لیے گہری باولیاں کھود رکھی تھیں۔ اُن دنوں ڈرینج کا کوئی باضابطہ انتظام نہ تھا۔ شہر کوئی چالیس وارڈ میں آباد تھا۔ ہر وارڈ میں دو تین محلہ جات ہیں۔ ہر محلّہ کی چنندہ جگہوں مسجد، مٹھ، مدرسہ، عاشور خانے، مندر، تعزیہ خانہ، شادی خانے، مارکٹ......... پر اس علت کے نمونے، صبح وشام آنکھوں کو کراہت سے دوچار کرتے۔ یوں دنیا کا کام بڑی فراغت سے چل رہا تھا۔ بھائی بتلاتے ہیں کہ بھلا ہو شریمان سریکار صاحب کا کہ انھوں نے شہر کی میونسپل اتھارٹی اور ممبران کے سامنے ''خنزیر کاری'' کی اسکیم پیش کی۔ اس اسکیم کے تخمینہ، نگہداشت، آبادکاری اور اونچ نیچ کی تمام تفصیلات کا احسن انداز میں جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ اسکیم سے متوقع آمدنی کا بھی اندازہ لگایا گیا تھا جو کھاد کی صورت میں حاصل ہونے والی تھی...... اسکیم منظور کر لی گئی اور دو تین ماہ بعد ہی شہر کے ہر محلّہ میں چار پانچ سوّر نظر آنے لگے۔ لوگوں نے دیکھا کہ اُن کے کام پر نکلنے تک ان کے محلّہ نمونوں سے پاک ہوتے اور لوٹنے تک یہ سوّر محلّہ کی چوکیداری میں اِدھر اُدھر آوازیں لگاتے گشت کرتے ہوتے......... دنیا کا کاروبار چل رہا تھا۔ آدمی اس لحاظ سے برتر ہے کہ وہ سال بھر میں ایک ہی بچہ دنیا کو دے سکتا ہے مگر سوّر اس لحاظ سے شاید کمتر ہے کہ وہ سال بھر میں آٹھ نو بچے دنیا کو دینے پر قادر ہے........ بھائی بتلاتے ہیں کہ موجودہ دس سالوں میں ہر کوئی شریمان سریکار کو لعن طعن سے نوازنے لگا۔ مگر اتھارٹی خاموش ہے۔ سوچ

وچار کررہی ہے۔

سوچ کے دھارے کو پلٹتے ہوئے میں نے موٹر سائیکل کو کِک لگائی۔ موسم سرما ہے مگر دھوپ تیز تھی۔ کولتار کی سڑک پر کہیں کہیں مائع بہہ رہا تھا۔ آرٹس کالج کے کھلے کینٹین پہنچا تو حسبِ توقع، مولسری درخت کے سائے میں واجدہ میری منتظر تھی۔ واجدہ کے ساتھ مصیبت یہ تھی کہ ہر کوئی اس کے چہرہ کو دیکھنے سے پہلے اُس کے سینہ پر نظر ڈالنے میں اپنے آپ کو مجبور پاتا اور پھر اُسے زندگی بھر اپنے مصور نہ ہونے کا ملال ہوتا۔ وہ مجھے غصہ آور نظروں سے گھور رہی تھی۔

'اتنی دیر لگادی'

'بات کیا ہے' میں نے بیٹھتے ہوئے کافی کی آواز لگائی 'کیوں بلایا تھا'

'تم کب سدھرو گے'

'کیوں؟ اب کیا ہوا'

'اتنی گرمی پڑ رہی ہے اور کافی'

'دو تھمس اپ' میری آواز گونجی 'خوش'

'کوچنگ میں مصروف تھے'

'اس ارجنسی کا کارن'

'نوکری کی کوششیں تیاگ دیں کیا؟'

'مجھے اس دھوپ میں کیوں ڈسٹرب کیا'

'کب تک اِس کوچنگ کے سہارے زندگی کاٹ سکو گے'

'بیس ہزار ملتے ہیں'

'کینٹین والا چالیس ہزار کماتا ہے'

'کیا اسی لیے کالج آتی ہو۔ کس نے بتایا تمھیں'

'اُردو کے پروفیسر صاحب نے'

'مہاشیے یہ معلومات بھی شیر کرتے ہیں'

'صرف مجھ سے'

'ہر ایک کو اسی غلط فہمی میں رکھا ہے.......... میری آمدنی کے تقابل میں کہا ہوگا'

'بے چارے فرنچ کٹ داڑھی رکھتے ہیں اور میرا تو آخری سمسٹر ہے'

'تو....... اچھا بلایا کیوں۔ بس ہانکے جارہی ہو'

'ابھی ہانکا کہاں ہے۔ وشنو وردھن کی کتھا نہیں سنو گے'

میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا 'پھر کیا کیا اُنھوں نے'....... میرے ذہن میں وشنو ردھن صاحب کا سراپا اُبھر آیا۔ سُرخ سپید چہرہ، طوطے جیسی ناک، کشادہ پیشانی، سرخی مائل بال، بڑے بڑے کان، پتلے پتلے ہونٹ، کرنجی آنکھیں، عمر کوئی 45 سال، بے حد ذہین، آواز بھرائی ہوئی، سکالر، یونیورسٹی حلقہ تک با اثر، بے اندازہ دولت مند کے مالک، کئی تعلیمی، طبی اور تجارتی اداروں کے مالک، خاندان کے واحد چشم و چراغ، غیر شادی شدہ اغلبًا کنوارے..... واجدہ کا معاملہ نہ ہوتا تو نہ پسند کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

'وہ کیا کرے گا منحنی طوطا' واجدہ کے لہجہ میں حقارت تھی۔

'تو ہوا کیا؟'

'دراصل میں نے دو روز سے اس کی کلاس اٹنڈ نہیں کی تھی۔ اس اثنا میں ہر ایک سے میرے بارے میں دریافت کرتا رہا اور ڈپارٹمنٹ میں آنے کے لیے کہا، میں اب کے پوری

تیاری کے ساتھ ڈپارٹمنٹ گئی تو اس نے حد ہی کر دی اور کہا:

'آؤ سوئٹی......... تمھارے بغیر تو میرے لیے یہ کالج ویران ہے'

'یہ تو اُنھوں نے ٹھیک کہا' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

'سوئٹی یا ویرانی؟' اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

'سوئٹی' ہونٹوں پر اُنگلی رکھتے ہوئے' ادھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ آم کے درخت تلے دو ایک لیکچرار براجمان ہو گئے تھے۔ اسٹوڈنٹ کا ایک گروپ داہنی جانب ہمیں کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔

'کیا تم نے چکھا ہے کبوتر؟ کس کی اتنی مجال کہ مجھے چھو بھی سکے' واجدہ کا چہرہ تمتما گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

'میں نے جب طوطے سے کہا کہ اس کی یہ ساری بات چیت اپنے موبائل میں ریکارڈ کر لی ہے اور اُسے یونیورسٹی کانوکیشن میں طشت از بام کرنے والی ہوں تو اُس کی حالت دیکھنے کی تھی۔'

'دیکھو ایسا ہرگز نہ کرنا۔ میں تو سنجیدگی کے ساتھ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ پرماتما کی سوگندھ........ اُس نے گگھیانے کی حد کر دی۔ سچ مچ ہی وہ بہت نازک اور ڈرپوک نکلا۔ میرے ایک نفسیاتی وار ہی سے وہ کانچ کے مرتبان کی طرح ٹوٹ گیا۔'

'پھر اب کیا ارادہ ہے تمھارا' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

'کیا شادی کا' اُس کے لہجہ میں استہزا تھا۔

'تمھارے ایکشن کا' تم کالج میں رہ نہ پاؤ گی، اُن کی پہنچ اوپر تک ہے'

'ایسا کچھ نہ ہوگا۔ وہ واقعی مجھے چاہتا ہے۔ میں نے اُس سے اُٹھک بیٹھک بھی

کرائی ہے۔ اُسے اپنی عزت اور مان کا بڑا خیال ہے...... اچھا رحمان، سچ سچ بتانا میں کیسی لڑکی ہوں۔ سچ بتانا'

میں کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور خاموش رہا........

'دیکھو......... میں کچھ بھی خیال نہیں کروں گی۔ پلیز'

'تم Possessive اور لوبھی ہو' میں نے تھوڑا سا اُداس ہو کر جواب دیا۔

''ہاں....... میں لوبھی تو یک دم سے ہوں۔ مجھے لوبھ ہے دولت کا، شہرت کا، عیش وعشرت کا، گھومنے پھرنے کا، شان دار زندگی کا، شان دار ماحول میں جینے کا، مجھے لوبھ ہے پاور کا'' اس کی آواز میں جوش تھا۔

'اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ وہ تمھارا مسئلہ ہے۔' میں نے بے بسی سے کہا۔

'کیوں مجھ سے شادی کا خیال تیاگ دیا ہے'

'تم بھی کیا.........'

'ہاں........ ہاں تم کو تو عشق کا زکام ہوتا رہتا ہے'

'کیا فالتو باتیں کرتی ہو۔ اِسی لیے مجھے کال کیا تھا.......' میں ہتھے سے اُکھڑ سا گیا۔

'اس خیالِ خام میں مت رہنا کہ کسی کو چر پر مہربان رہوں گی'

'مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے' میں نے پلٹ کر ترکی بہ ترکی جواب دینے میں ہی عافیت سمجھی۔

'پھر کیوں میرے پیچھے تین سال سے پڑے ہو'

'اب تم بلاؤ بھی تو نہیں آؤں گا'

'براماں گیے کبوتر'....... میں نے دور سے دیکھا کہ ہرش وردھن اور پروفیسر باسط آم کے گوشہ کی طرف رواں ہیں۔ پروفیسر ہرش وردھن آرام کرسی پر دھنس گئے اور باسط صاحب ہماری جانب آرہے تھے۔

'واجدہ میں ڈپارٹمنٹ میں تمھارا ویٹ کروں گا۔' اُنھوں نے ایک خشمگیں نگاہ مجھ پر ڈالی اور گویا ہوئے۔

'رحمان' آج کے اخبار میں خلیج میں Vaccancy کا اشتہار ہے۔

'شکریہ جناب ان معلومات کا مگر میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔' وہ میرے جواب کو اَن سنا کیے چل دیے۔

'اپنے بھیا بھابی اور بچوں کا خیال کرو۔ کوئی ڈھنگ کی نوکری کیوں نہیں تلاشتے۔ کب تک وہ تمھیں..........'

'میں کسی کے سہارے نہیں جی رہا ہوں'

'بیس ہزار میں کتنے گھر پر دیتے ہو'

'تم سے مطلب؟'

'تم نے لائن ہی غلط چنی۔ انجینئرنگ وغیرہ میں اب کوئی چارم نہیں رہا۔ ہمیں اب قانون پڑھنا چاہیے۔'

'تم پڑھ رہی ہو'

'میں...... میں قانون کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہوں۔'

'میں چلتا ہوں، آج کافی وقت نکل گیا۔' میں نے اُٹھتے ہوئے ویٹر کو اشارہ کیا۔ 'تم اُردو کے ٹور پر جارہی ہو'

'میں احمقوں کے ساتھ ایک منٹ بھی رہنا پسند نہیں کرتی۔'

'نفیسہ بتا رہی تھی کہ ٹور لازمی ہے'

'وہ فرسٹ سیم والوں کے سامنے کچھ بھی ہانکتے رہتے ہیں۔'

اُس نے بل کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ انتظاریہ کا بھی بہت کچھ تھا۔ ہنستے ہوئے بس اتنا کہا' اُدھار میری طرف'۔

پتہ نہیں کیوں، مجھے اُس کے دانت پہلی بار بڑے نوکیلے لگے۔

کمرہ پر پہنچا تو گرمی ویسی ہی تھی۔ فین آن کیا، سامنے تپائی کے پاس MYF کا دعوت نامہ پڑا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے اس کی لگاتار میٹنگیں ہو رہی تھیں۔ میں نے شام کی کوچنگ ہی بند کر دی تھی۔ اسٹوڈنٹ چیں بہ چیں تھے...... دعوت نامہ کھولتے ہی مجھے ایک قسم کی کوفت اور الرجی ہوتی۔ ہر دعوت نامہ کی ابتدا کچھ اس قسم کی تحریر سے ہوتی۔

'محترم.......

سلام علیکم۔ جیسا کہ آپ اس بات سے آگاہ ہیں کہ MYF گذشتہ دس سالوں سے ملّت کے مذہبی، تہذیبی، معاشرتی مسائل پر نمایاں اور مثبت انداز میں سرگرم عمل ہے.........' میں نے بے دلی سے تاریخ اور وقت دیکھا۔ آج ہی عصر کے بعد ایمرجنسی میٹنگ طلب کی گئی تھی......... میں نے اطمینان کی سانس لی۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا تھا کہ جو میٹنگیں عصر کے بعد بلائی جاتی رہی ہیں، وہ تقریباً پہلے سے طے شدہ نتائج کی حامل ہوتی رہی ہیں۔ ہمارا کام محض ریزولوشن پر دستخط کرنا ہوتا......... پیروں پر خوب ٹھنڈا پانی ڈالا اور بستر پر اپنے آپ کو ڈھیر کر ڈالا اور سوچنے لگا۔ پتہ نہیں کس دھن میں فورم کی ممبر شپ قبول کی تھی۔ مجھے ان کی سرگرمیوں اور بیانات سے دلچسپی ضرور تھی مگر وہاں کے تصنع آمیز ماحول سے گھٹن

ہوتی۔کئی بار سوچا کہ فورم سے استعفیٰ دے دوں مگر اسے عملی جامہ نہیں پہنا سکا تھا........ کیا میں کسی ان جانے خوف سے مبتلا تھا؟ یا مجھے کسی تحفظ کی ضرورت لاحق تھی؟۔یا میں کسی پشیمانی میں مبتلا ہوں۔میں انے اپنا بار ہا تجزیہ کیا مگر مجھے تشفی نہیں ہوسکی۔نیند ہلکے ہلکے مجھ پر غالب ہوتی گئی۔

خواب میں مجھے واجدہ کے چمکتے دانت پھیلتے دکھائی دیتے رہے.........

جاگا تو JCB کا خیال آیا۔آج شہر میں چاروں طرف JCB ہی کا چرچا اور بحث و مباحثہ ہے۔اسی لیے تو شہر کے بیش تر سو ر JCB کے شور اور گڑ گڑاہٹ سے خوف زدہ ہوکر نئے علاقوں اور کالونیوں میں بھاگ آئے تھے......... یہ JCB مختلف آکار کے،مختلف ہیئت اور سائز کے،مختلف مقاصد کے،مختلف کاموں کے،مختلف.......... ان کا کام نشان زد عمارات،مقامات اور جگہوں کو زمیں بوس کر دینا تھا۔ان میں تاریخی آثار کی عمارتیں بھی تھیں۔قبرستان،منادر،مساجد،کمانیں،نقار خانے،غیر مجاز تعمیرات .... غرض وہ کیسی ہی جذباتی وابستگیوں کی حامل ہوں،کمشنر کے آرڈر پر،پولیس کی نگرانی میں نیست و نابود کی جا رہی تھیں۔قدیم تہذیب وتمدن کے آثار اور نشانیوں کو،نئی تہذیب وتمدن میں متبدل کرنے کا عمل،ایک عالم گیر حقیقت کا مظہر بنتا جا رہا تھا..........

کوئی آٹھ روز پہلے،جامع مسجد کے پھاٹک سے متصل 15 x 10 کا ایک کٹہ تھا جس کے شمال اور جنوب پر دو قدیم پکی قبریں تھیں۔لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ یہ دو بزرگوں کی قبریں ہیں....... کمشنر نے MYF کے ممبران اور چند ذی علم حضرات کو اپنے کیبن میں طلب کیا۔دورانِ گفتگو کمشنر نے ہماری ایک روایت کو کوٹ کرتے ہوئے استفسار کیا کہ اب ان قبروں کا کوئی جواز ہے یا روایت پر سوالیہ نشان لگایا جائے؟ سب بھونچکے رہ گئے اور واپس لوٹ آئے۔

اُسی رات ایک بجے پولیس کی جمعیت میں JCB نے اُن قبروں کو زمین کے برابر کردیا۔ ان کتوں کی تباہی کے بعد، پھر سے ایک بار شریمان یشونت راؤ نے MYF کو اپنی درخواست دی۔ دو تین روز اس درخواست پر غور کیا جاتا رہا......... قصہ دراصل یہ تھا کہ جامع مسجد کے باہری حصہ سے اُس کی ایک جنوب مغربی دیوار قریب '100 تک ہے۔ یشونت راؤ کی کوٹھی کی شمال مغربی دیوار قریب '80 تک جاتی ہے۔ ان دونوں دیواروں کے بیچ ایک "5'.5 کا خالی پیسیج ہے۔ عام دنوں اور بالخصوص بارش اور سرما کے موسم میں اس پیسیج کو سینکڑوں سور اپنا بسیرا بنا لیتے اور رات بھر اپنی بے ہنگم آوازوں سے مصلیان اور کوٹھی کے مکینوں کے لیے اذیت اور مصیبت کا باعث بنتے، پھر دن میں اُن کی گندگی سے ہر کوئی بیزار تھا......... یشونت راؤ نے MYF کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ اس پیسیج کو یا تو مسجد کمیٹی یا یشونت راؤ اپنے خرچ سے چسپاں دیوار سے بھر لیں۔ چسپاں دیوار تعمیر کرنے والے کی ذاتی دیوار متصور ہوگی جس پر فریق ثانی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا اور اس اذیت سے نجات مل سکے گی....... یشونت راؤ نے مسجد کمیٹی کے فیصلہ کو مقدم کرنے کی رضامندی ظاہر کی تھی........ تجویز معقول اور مصالحانہ تھی۔ کسی صاحب نے میٹنگ میں یشونت راؤ کے HES کے سکریٹری ہونے کی بابت سوال اُٹھایا۔ جواب میں کسی نے اُن کے MYF عاملہ رکن ہونے کی بابت کہا اور انھیں سمجھایا گیا کہ کسی کو بھی اپنے سنگھٹن سے وابستہ ہونے سے کیسے روکا جا سکتا ہے۔ آج کی ایمرجنسی میٹنگ میں یشونت راؤ کی تجویز پر فیصلہ لیا جانا تھا۔

کرتا پاجامہ زیب تن کیے، میں کمرہ سے باہر نکلا۔ برگد کی جٹاؤں اور شاخوں کے درمیان سورج زوال کی طرف گام زن تھا۔ موٹر سائیکل سٹارٹ کیے مسجد کی جانب بڑھا۔ نماز کے بعد بھی میٹنگ حسبِ توقع دیر سے شروع ہوئی۔ حسبِ توقع یشونت راؤ کی تجویز کو بالاتفاق

منظور کرلیا گیا۔ ریزولوشن میں لکھا گیا کہ یشونت راؤ کو '80 x 3/4 2 جگہ کا معاوضہ دیے جانے کا بندوبست کیا جائے اور مسجد کی ذاتی چسپاں دیوار تعمیر کی جائے۔ ٹینچ کو فوری طور پر ایک متصلہ دیوار کے سہارے بند کیا جائے۔ MYF مسجد کے باہری حصہ 20x15 پر ایک شاپنگ کامپلکس تعمیر کرے گی۔ میٹنگ سے باہر نکلنے کے بعد یشونت راؤ سے ملاقات ہوئی۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے انھوں نے فیصلہ پر خوشی کا اظہار کیا۔ میں وہاں سے نکلا اور گھر کی جانب چلا۔ بھائی اور بھابی سے ملے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔

دن رات JCB کی گھڑ گھڑاہٹ میں کٹتے رہے۔ اس عرصہ میں واجدہ کی کوئی کال نہیں آئی تھی۔ میں نے بھی خاموشی سادھ رکھی تھی۔

کرسمس کے دوسرے دن کو چنگ کے خاتمہ پر نفیسہ نے تنہائی میں کہا:

'سر آپ کو علم ہے......'

'اب سسپنس ختم کرو۔ تم بات سیدھے کیوں نہیں کرتی ہو'

''سر...... کیسے کہوں....... آج واجدہ بیگم اور وردھن صاحب کا لگن ہے''

'کیا......' مجھے سکتہ سا ہوا۔

'انوپم منڈپ میں دوپہر 12.34 بجے'

'اب تم جاؤ یہاں سے پلیز'........ وہ چلی گئی اور میں دیر تک روہانسا رہا۔

پھر اٹھائیس ڈسمبر کو کوچنگ کے وقت سے پہلے نفیسہ گھبرائی سی آدھمکی۔

'سر آپ کو علم ہے......'

'خدا کے لیے......' میں نے چڑ کر کہا۔

'کل شام پروفیسر ہرش وردھن کا دیہانت ہو گیا......'

'کیسے.....؟'

'وہ تو مجھے علم نہیں مگر سنا ہے کہ پولیس واجدہ کو پوچھ گچھ کے لیے اپنے ساتھ لے گئی ہے'

میں نے اُسے رخصت کرتے ہوئے پولیس اسٹیشن کی راہ لی...... مگر راستہ ہی میں واجدہ کو نیلی کار میں دیکھا۔ میں کمرہ پر لوٹ آیا۔

دو چار روز بڑی پریشانی میں گذرے۔ میں نے بارہا واجدہ کو فون کیا مگر اُس سے رابطہ نہ ہو سکا۔ 'اُس نے اپنا نمبر بدل لیا کیا؟' میں نے سوچا۔

چار پانچ دن بعد ہرش وردھن کی موت پر تفصیل سے خبر آئی۔ اخبار میں لکھا تھا کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں اُن کی موت Cardiac Arrest کے باعث ہوئی۔ ونیتا وردھن پر کوئی الزام نہ تھا۔ وردھن کی موت کو قدرتی قرار دیا گیا........ مجھے خیال آیا کہ کانچ کا مرتبان چھن سے ٹوٹ گیا۔

مگر شہر میں JCB نے کانوں کو اپنی آوازوں سے بہرہ بنا رکھا تھا۔ شہر کے سوراب بھاری تعداد میں ہماری نئی کالونیوں میں آباد ہونے لگے تھے۔ یہ سلسلہ چار پانچ ماہ چلتا رہا۔

جون کے مہینہ میں بھائی اور بھابھی نے مجھے بلا بھیجا۔ وہ اپنے سب سے چھوٹے لڑکے کا داخلہ AIMS میں کرنا چاہتے تھے۔

'کم از کم ایک بچہ تو معیاری اور اونچی جگہ تعلیم پائے۔ تم کوشش کرو تو یہ ممکن ہے۔ میں اپنی زندگی کی ساری پونجی اس بچے کے داخلہ اور تعلیم و تربیت پر لگا دوں گا' بھائی نے حسرت سے کہا۔ میں نے کچھ کہنا مناسب خیال نہ کیا۔

الصبح، شکور کو ساتھ لیے، AIMS پہنچ گیا۔ وہاں ایک لمبی قطار پہلے سے موجود

تھی۔منیجر کے کمرہ میں ہمیں ایک سلپ دی گئی۔جس میں نام،کلاس اور موبائل نمبر درج کرنے کے لیے کہا گیا........ کوئی آٹھ بجے نیلی کار AIMS میں در آئی۔ونیتا وردھن کار سے اُتری اور اُس نے اپنا گوگل اُتار کر قطار پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔مجھ پر نظر پڑتے ہی اُس نے اپنا گوگل پہن لیا اور اپنے کیبن کی طرف چل دی۔لوگ اپنے انٹرویو دینے کیبن میں آتے جاتے رہے۔ایک لاکھ،ڈیڑھ لاکھ،تین لاکھ،چار لاکھ کے ڈونیشن پر خوشی اور طمانیت کا اظہار کرتے رہے۔میں قطار سے الگ ہو جانے کی سوچ رہا تھا کہ منیجر میری طرف آیا اور آہستگی سے کہنے لگا۔

'میڈم نے آپ کو پھاٹک کی طرف ٹھہرنے کے لیے کہا ہے'

میں وہاں سے پھاٹک کی طرف آیا۔شکور بار بار''چاچا اب ایڈمیشن ہوگا'' کی رٹ لگائے جا رہا تھا۔

کوئی آدھا پون گھنٹہ بعد میڈم کیبن سے نکلی اور اپنی کار میں سوار ہوئی۔ڈرائیور نے کار ٹرن کی اور پھاٹک پر بریک لگائے۔ڈرائیور نے مجھے سلام کیا تو میں نے جانا کہ وہ واجدہ کا بڑا بھائی یاسین ہے۔

کھڑکی پر ہاتھ رکھے ونیتا مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''تمھارے بھتیجے کے داخلہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے........ دراصل مجھے اپنے اداروں کے لیے ایک شریف اور اعلیٰ تعلیم یافتہ CEO کی ضرورت ہے۔تمھیں پچاس ہزار ابتدائی مشاہرہ ملے گا۔منظور ہو تو کل بچے کا فری ایڈمیشن کرا لینا۔'' میرے کچھ کہنے سے قبل کار ایک دم سے اسٹارٹ ہوئی اور دھول اُڑاتی غائب ہو گئی۔

گھر بڑی مشکلوں اور رکاوٹوں کے بعد پہنچا۔شہر ملبہ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا تھا۔

نئے انفراسٹرکچر کا کام بھی ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی شکور نے 'میرا ایڈمیشن ہوگیا' کی رٹ لگائے ناچنے لگا۔ بھائی کو آفس سے آنے میں دیر تھی۔ وہ ریٹائرڈ ہوکر ایک پرائیویٹ فرم میں کام کررہے تھے۔ بچے بھی اسکول سے دیری سے آتے۔ بھابھی نے کوچ پر لیٹ جانے کا مشورہ دیا اور خود گلاب جامن تیار کرنے کا عندیہ ظاہر کرتے ہوئے کچن کا رُخ کیا۔ میں صوفے پر لیٹا اخبار میں مشغول ہوگیا۔ کھڑکیوں سے سوٗروں اور JCB کی ملی جلی بے ہنگم آوازیں آتی رہیں۔ پتہ نہیں ان دونوں سے کب نجات ملے گی۔

شام بھائی آئے تو ہم دونوں نے ایک عرصہ بعد مل کر کھانا کھایا۔

''میں جانتا تھا صرف تم ہی یہ کام انجام دے سکتے ہو۔ کتنا طلب کیا واجدہ نے''

میں نے بات ٹالی اور جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ بھائی نے موسم کا حوالہ دیتے ہوئے یہیں سو جانے کے لیے اصرار کیا۔ ثمینہ اور رخشندہ نے بھی رُک جانے کو کہا۔ مگر مجھے تنہائی کی شدت سے طلب ہو رہی تھی.........

کمرہ پہنچنے تک رات اپنا ڈیرہ ڈال چکی تھی۔ طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ بار بار بجلیوں کے کڑکنے اور چمکنے کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے لائٹ آف کی اور بستر پر لڑھک گیا۔ آنکھیں میچے دیر تک جاگتا رہا اور پھر پتہ نہیں کب مجھے نیند آگئی۔

رات خواب میں دیکھا کہ میرے کمرہ کے اطراف JCB مسلسل چکر لگا رہا ہے۔ ڈرائیور کی سیٹ پر ونیتا عریاں سینہ کے ساتھ دانت چمکا رہی تھی........

ابھی اندھیرا تھا۔ کھڑکیوں سے مدھم روشنی جھلک رہی تھی۔ میں نے لائٹ آن کی اور ٹھٹھک گیا۔ آج تو اور دنوں کے مقابلہ میں، بہت بڑی تعداد میں اُنھوں نے میرے کمرہ کو اٹ سا دیا تھا۔ کمرہ میں اُن کا داخل ہونا ایک دشوار کن مرحلہ تھا۔ پھر بھی آج وہ کسی نہ کسی طرح

میرے کمرہ میں بڑی تعداد میں بکھر گئے تھے۔میں نے مالک مکان سے کھڑکیوں میں پٹ لگوانے کے لیے کہا تو اُس نے ایسی نظروں سے دیکھا تھا کہ'رہنا چاہو تو رہو ورنہ کمرہ خالی کردو'۔میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اپنی طرف سے پردہ لگائے مگر دوسرے ہی دن پردے پھاڑ دیے گئے........ کیا کوئی مجھے اپنی نگرانی میں رکھنا چاہتا ہے، میں نے سوچا تھا، کمرہ لب سڑک ہی تھا اور ہر آنے جانے والے کی پہنچ میں تھا۔میں نے سب سے پہلے بستر پر سے اُنھیں سمیٹا اور سرہانے کو بھی صاف کیا۔پھر پورے کمرہ کو جھاڑو دی اور پتوں کا ڈھیر Sweeper Pan میں اکٹھا کیا اور ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ڈسٹ بن تک پکڑے میں نے دروازہ کھولا اور دہلیز پر ہی میرے پاؤں سُن سے ہوگئے۔

برگد کا طویل قامت قدیم درخت اپنی جٹاؤں سمیت ڈھیر ہو چکا تھا۔اُس کی بائیں جانب JCB ساکت کھڑا تھا۔دور دور تک مجھے کوئی سو ر دکھائی نہیں دیا۔دیر تک میں اکیلا ہی کھڑا رہا......... ●●

اُس گلی سے

موسم کہر، پتہ نہیں کتنے عرصہ سے اپنے نوکیلے پنجے میرے وجود میں گاڑ چکا ہے۔ وہ اپنی نوکیلی خم دار چونچ سے میرے ذہن میں پیوست ایک ایک ہیولے کونوچ کر پھینکتا رہا ہے۔ اس کے اندر سرسراتی اونگھ اور غنودگی میرے اندر بھی رچ بس گئی ہے۔ دونوں سلاخوں کے بیچ میں نے دیکھا، اب بھی سارے کا سارا دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ پل پل گزرتے ہوئے ٹیلے، لق ودق میدان میں ببول کے درخت، مردہ تالابوں میں ساکت پڑا پانی گویا وہ ان سب پر محیط، میرے ساتھ سفر کررہا ہے۔ اس پر میرا کب اختیار تھا۔ یہ شب کلفت تو اس لمبے سفر کا حاصل ہے۔ حالاں کہ میرا یہ سفر بے فیض بھی ہوسکتا تھا۔ مگر اس سے مفر کی کوئی صورت مجھے نظر نہیں آئی..........

مطلوبہ روانگی سے پہلے کا سارا عرصہ خوف اور اندیشوں کا اثاثہ تھا۔ ان دنوں میں اپنے کالج کے ساتھیوں سے خواہ مخواہ غیر متعلقہ گپ شپ کیا کرتا تھا تا کہ اس تذکرہ کا سامنا نہ

ہو سکے جس امکانی گفتگو کے تصور سے ہی میرے اندر خوف اور شکستگی کا احساس جاگتا تھا۔ یہ ایک عجیب صورت حال تھی۔ میرے تمام ساتھی میری ایک ایک حرکت، میرے چہرہ پر ابھرتے تاثرات کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کر رہے ہوتے۔ مجھے محسوس ہوتا کہ وہ سب اندر ہی اندر ایک فتح مند انبساط اور عرصہ سے چلی آ رہی کلفت سے اپنے آپ کو آزاد پا رہے ہیں۔ تب مجھ پر غنودگی کے سائے لمبے ہو جاتے۔ میں نے یاد کیا گویا تسخیر ہیولی ہم زاد پوری طرح مسلط ہو چکا ہے.......

کالج کے اس گھٹن زدہ ماحول سے بچنے کے لیے میں ایک لمبی رخصت پر جانا چاہتا تھا مگر جواز کی تلاش ایک لازمی ضرورت بن کر رہ گئی تھی۔ طبی جواز میرے اندر ایک مجرمانہ احساس جگاتا۔ ایک دن بوئے گل کے پریشاں نکلنے کو بڑی بے دلی سے واقف کرار باتھا کہ انٹڈرنے دوست کا تار میرے حوالے کیا۔

''کاف شہر میں ہے۔ فوری نکلو''

غنودگی کا سر سراتا سایہ مجھ پر محیط ہوا۔

میں جہاں رہتا ہوں وہ شہر کی بہت چھوٹی سی وقف بستی ہے۔ پتہ نہیں کس نے اس وقف بستی کو ''گیارہ گلی'' کا نام دیا تھا۔ تھوڑی بلندی سے اس بستی پر نظر دوڑائی جائے تو اسے گیارہ گلیارے کہنا زیادہ مناسب ہوتا۔ ہر گلی سے متصل چند رہائشی مکانوں کے سلسلے تھے۔ ان گلیوں کے بیچوں بیچ سے سیاہ سنگ سے پٹا تنگ راستہ گزرتا تھا جس کا ابتدائی سرا نگریشور مندر سے شروع ہوتا اور آخری سرا درگاہ خنداں ماں پر ختم ہوتا۔ ہر گلی سے ملحق راستوں پر مندر اور درگاہ سے متعلق اصحاب نے پتہ نہیں کیوں روایتی انداز کی قندیلیں، نیلے اور سبز رنگ شیشوں کے مکعب نما حلقوں میں جلائے رکھنے کا اہتمام کیا تھا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ روشنیوں کی

یہ تقسیم اس نزع کا اعلان نامہ تھی جو وقف جائداد سے متعلق تھی۔ بہ ہر حال رات بہت بلندی سے اس بستی کا مشاہدہ کیا جائے تو ایسا لگتا کہ شہر کے اس حصہ پر ایک طویل قامت مورا پنے پر پھیلائے بیٹھا ہے جس کی کلغی درگاہ ہے اور پچھلا حصہ مندر.........ان گلیوں کے سارے مکین حکومت کے کسی نہ کسی شعبہ میں ملازم تھے۔ وقف جائداد کا تنازعہ، مقدمہ، اور ماحول کا تشنج اکثر ان کے چہروں سے ظاہر ہوا کرتا تھا۔ چاہے کوئی موسم ہو، اس وقف بستی پر کہر اور دھند مسلط رہتی۔ ادھر کے مصاحب اسے خنداں ماں کا فیض کہا کرتے اور ادھر کے متوالے اسے نگر یشور کی مایا خیال کرتے۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ مندر سے متعلق وقف جائداد کی آٹھویں اور آخری گلی میرا مسکن ہے۔ اور درگاہ سے متعلق وقف جائداد کی تیسری اور آخری گلی میں وہ قیام پذیر تھی۔ ہم دونوں کے مکان آمنے سامنے تھے۔ وہ اپنے پتا جی کے ساتھ رہا کرتی تھی اور میں اپنی ماں کے ساتھ مقیم تھا.........وہ کامنی تھی۔

کامنی کی یادوں کے ساتھ اونگھ کا پنجہ میری روح میں اترتا محسوس ہوا.........میں تارلیے کلاس سے باہر نکلا اور لڑکھڑاتے قدموں سے مہاجن کے چیمبر کی طرف بڑھنے لگا۔ آخرکار جواز کا روشن دان کھل چکا تھا۔ میں نے ایک لمبی رخصت کے لیے عرضی دی۔ مہاجن کا رویہ میرے ساتھ مشفقانہ تھا۔ اسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ ادارہ میں میں ہی اکیلا الگ مسلک سے وابستہ فرد ہوں۔ ویسے اس کی غیر معمولی شفقت مجھ میں علاحدگی کا احساس بھی پیدا کرتی۔ مجھے محسوس ہوتا کہ ادھر ادھر اس کے مشکوک مشفقانہ رویے نے بھی مجھ پر غنودگی کے دورے طویل کر دیے تھے۔ اس غنودگی کی ابتدا ایک ہلکی سی اونگھ سے ہوئی تھی.........

شام دروازہ پر دستک ہوئی تو میں طرح طرح کے اندیشوں میں گرفتار ہوا۔ دروازہ

کھولا تو سامنے پنڈت تھا۔اس کے چہرہ پر کبیدگی ہویدا تھی۔آٹھ تاریخ تھی، میں نے ماں کو آواز دی اور اندر کے کمرے میں چلا گیا۔ماں نے کرایہ ادا کیا۔تھوڑے وقفہ کے بعد پنڈت نے اونچی آواز میں کہا۔

''اپنے لڑکے کی آنکھوں پر پہرہ لگاؤ۔ایسا نہ ہو کہ ....''

اسی لحظہ ہلکے سے چکر کے ساتھ اونگھ کا احساس ہوا۔اس اونگھ کے بطن سے ایک ہیولی ابھرتا محسوس ہوا۔کامنی.........

اس دن اپنے متعینہ انتظاری وقفہ میں میں نے حیات بابا سے اس مسلسل اونگھ کا علاج چاہا۔انھوں نے کہا۔

''تسخیر ہیولی،ہم زاد ہوجائے گا۔اس عمل سے دورر و۔ربط میں ضبط کا خدشہ ہے۔'' ''کون ہم زاد؟'' میں نے پوچھا۔

''اپنی پسلی سے ان جان ہے۔'' انھوں نے جواب دیا۔

میں کچھ جان ہی نہ سکا۔حیات بابا کی اس قسم کی باتوں پر لوگ وارفتہ تھے۔ہمیشہ ان کے اطراف عورتوں کا جمگھٹا رہتا۔وہ انھیں درگاہ خنداں ماں میں رکھی راکھ کی چٹکی دیا کرتے، مور چھل سے پیٹا کرتے۔یہی علاج شافی تھا۔میں اُن ہی دنوں درگاہ پر آتا جب کامنی اپنی پوجا کی بٹی میں موتیے کے پھول لیے نکلتی۔

صبح کی اولین ساعتوں میں میں فرش پر لیٹا اپنے سامنے کی میز کی جانب ٹکٹکی لگائے ہوتا۔کمرہ کا پچھلا پٹ زاویہ انعکاس کی زد میں کھلا رہتا۔گلی میں گزرتے کسی ذی نفس کو ہماری اس خفیہ معاملات کی بھنک نہیں پڑ سکتی تھی۔ماں کو خلل میں ڈالنے کے لیے میں نے بے ترتیبی سے اشیاء پھیلادی ہوتیں۔کنجیوں کے گچھے،ٹوتھ برش،واچ،کیلکولیٹر،ماچس،رنگارنگ پن،

کنگھی، برش، مشروبات کے ڈبے، کیپسول کے ریپر، تعلیمی نوٹس، ٹارچ، سبھی بکھرے ہوتے۔ ان بکھری اشیاء کے بیچ پلاسٹ جگ سے ٹکی مصنوعی ممنوعہ روشنی کی سیاہ سطح پر خفیہ معاملات کا منظر اچانک طلوع ہوتا، جب سامنے مکان کا دروازہ ہلکے سے وا ہوتا اور کامنی پوجا کی تھالی میں پہلے سے طے شدہ پر معنی رنگوں کے پھول لیے مندر کے لیے نکلتی۔ موتیا کے پھول درگاہ پر دیدار کا اشارہ ہوتے اور گلاب کے پھول مندر آنے کا عندیہ اور گیندے کے پھول اس کے کمرہ میں بلاوے کا اشارہ۔

اس دن گیارہ گلی میں گہرا کہرا سا کت تھا۔ پھر بھی میں مصنوعی ممنوعہ روشنی کی سیاہ سطح پر اپنی خفیہ معاملات میں مشغول تھا۔ کئی جاں گسل لمحات کے بعد دروازہ کا پٹ آہستگی سے کھلا۔ میری آنکھیں پوجا کی تھالی پر جم سی گئیں۔ گیندے کے پھول........ اب یہ لمحے اور جان لیوا ہو گئے۔ مقررہ وقت پر ماں کو رخصت کر کے سٹی بس اسٹینڈ سے لوٹتے ہوئے میں نے مین روڈ کی داہنی گلی سے اس کے پتاجی کو حسبِ توقع آٹو اسٹینڈ کی جانب رواں دیکھا۔ مجھے اپنی تیز تیز چال کو مدھم کرنا پڑا۔ مندر کے دروازہ پر پنڈت کھڑا تھا۔ اسٹینڈ سے سیاہ سیلو سے پٹے تنگ راستے پر چلتے ہوئے میری سانسوں اور دھڑکنوں میں تموج موج زن تھا۔ وہاں پہنچا تو کامنی کو اپنا منتظر پایا۔ کمرے میں داخل ہوا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کا آنچل ڈھلک چکا تھا۔ چاہِ شکم اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ میرے وجود پر طاری ہوا۔ میں نے اپنی نوک زباں چاہِ شکم میں دھیرے دھیرے داخل کی اور اسے ہولے ہولے گھماتا رہا۔ کائنات کی گردش تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ اور تب ہی مجھے احساس ہوا کہ کوئی لمبی اونگھ نہیں بلکہ مجھ پر حقیقی غنودگی طاری ہوتی جا رہی ہے۔ ایک ہلکی سی چیخ بھی سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر پیچھے دیکھا پنڈت کے ہاتھوں میں لمبا سا ڈنڈا ہے اور میرے سر کے پچھلے حصے سے خون کی دھار رواں ہو گئی ہے۔ قہر آلود

دھمکیوں کے بیچ ادھ مری چال چلتے ہوئے میں اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ بہت منت وساجت اور میری تعلیمی مصروفیات کا واسطہ دینے کے بعد، انخلا کے لیے تین ماہ کی نوٹس دی گئی۔ پنڈت نے بہ ہر حال پتہ نہیں کیوں اس وقوعہ کو خفیہ ہی رکھا، میں اپنی ماں سے آنکھ نہیں ملا سکا، بستی چھوڑتے ہوئے ان دنوں میں نے محسوس کیا کہ ہیولیٰ ہم زاد خفیف سے خفیف تر ہوتا جارہا ہے۔ مگر سب یوں وقوع پذیر ہوگا اس کی کلپنا بھی میں نے نہیں کی تھی۔ بستی سے منتقل ہوتے ہوئے میں نے حیات بابا سے کہا۔

''میں ہیولیٰ ہم زاد کے معدوم ہونے کے اندیشے میں گرفتار ہوں۔''

انھوں نے چٹکی بجاتے ہوئے جواب دیا۔''جو معدوم ہے وہی موجود ہے۔ اس کا خوف نہ کر۔''

یونیورسٹی کے رزلٹ سے پہلے میری ماں ایک حادثہ میں دارفانی سے کوچ کر گئیں۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ کامنی کے پتا بھی اس بستی سے کہیں کوچ کر گئے ہیں۔ کائنات کی گردشوں میں کون کہاں رہ گیا یہ پتہ ہی نہیں چلا۔

''پتہ؟ اس کی کیا ضرورت ہے'' مجھ سے پہلی بار اپنے رخصتی عرصہ کا پتہ تحریر کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا بہ ہر حال میں نے دوست کی معرفت کا پتہ لکھا۔

مہاجن نے غالباً ازراہ مزاح مجھ سے کہا۔''ایک سال بعد ملو گے'' 1993 کچھ ہی دنوں بعد شروع ہورہا تھا۔ درخواست دے کر میں نے بس اسٹینڈ کا رخ کیا۔

نیم شب کے دھندلکے میں حسب توقع، بس تقریباً خالی تھی۔ اکا دکا مسافر ہی یہاں وہاں موجود تھے۔ اپنی سیٹ پر لڑھکتے ہی غنودگی کا حملہ ہوا۔ ایک لمبے عرصہ بعد کامنی کے دیدار کی توقع تھی۔ تعجب ہوتا ہے کہ آج لوگ دیدار کے وہ معنی نہیں سمجھتے جو ہماری داستانوں کا اثاثہ

ہے۔بچوں کو لفظ دیدار کے معنی سمجھاتے ہوئے مجھے اس بات کا شدید احساس ہوتا تھا کہ میں کسی اور ہی مخلوق سے مخاطب ہوں۔ پتہ نہیں یہ سفر کب ختم ہوگا........

آخر کار ناظم شب نے اپنا پردہ اٹھا لیا تھا۔شہر اور اس کے نواح میں دھند کی بارش ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا دوست سے ملنے سے پہلے بستی کا ایک چکر لگا لوں۔ہوسکتا ہے اتفاقاً تیسری گلی میں کامنی کا دیدار ہو اور ہیولیٰ ہم زاد کی مردنی جی اٹھے۔موسم کہر نے کس بے دردی سے میرے ذہن کے نہاں خانوں سے اسے نوچ پھینکا ہے۔اور ایک بے نام غنودگی میرا مقدر تھی۔کامنی پتہ نہیں پوجا کی بُٹی میں کون سے پھول لیے نظر آئے گی۔

بس اسٹینڈ پر اترا تو بے اختیار ماں کا خیال آیا۔کلفت شب اس سفر کا حاصل ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا مسافت چند ہی لمحے رہ گئی ہے۔گیارہ گلی۔سحر نے ابھی شہر کی زندگی کو ابھی ساکت ہی رکھا تھا۔البتہ مندر کی سمت گھنٹیوں اور باجوں اور نعروں کی آوازیں لگاتار آ رہی تھیں۔میں نے تیز تیز قدم اُٹھائے۔آٹو اسٹینڈ پر مجھے کامنی کے پتا کا تصور آیا۔مین روڈ سے ملحق بائیں جانب کی گلی چند قدم رہ گئی تھی۔اب شور کی آوازیں اور بھی بلند ہوگئی تھیں۔جیسے ہی اندر گلی میں داخل ہوا میں نے دیکھا لوگوں کا اژدھام مندر کی جانب رواں ہے۔کچھ لوگ ایک پالکی کو اپنے کاندھوں پر لیے مندر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔میں تیز تیز آگے بڑھتا گیا۔پالکی پر سوار سادھوی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ساکت سا ہوگیا۔کامنی اپنی آنکھیں بند کیے، پتہ نہیں کن گیانوں میں گم تھی۔میں نے سامنے گیارہ گلی پر نظریں دوڑائیں۔مگر وہاں کیا تھا۔وقف بستی کی جگہ کنکریٹ سے بھرا میدان کوئی گلی نہ تھی۔کوئی مکان نہ تھا۔کوئی مکین نہیں۔کوئی کلغی نہ تھی،طویل قامت مور پرواز کر چکا تھا۔ ●●

وارث علوی

اردو ادب میں جب جدید افسانے کی آواز
بلند ہوئی اس وقت لکھنے والوں میں جو نئے اور جدید افسانہ
نگار آئے ان میں اکرام باگ کا نام بہت نمایاں تھا۔ شب
خون میں وہ مسلسل چھپتے رہے ایک خاص قسم کا پراسرار
افسانہ ان کے قلم سے سامنے آیا۔ پڑھ کر حیرانی بھی ہوتی
،اس کی کوئی معنویت قاری کے ذہن پر آشکار نہیں ہو پاتی
لیکن اکرام باگ اسلوب، واقعہ نگاری اور وہ عناصر جو
افسانے کو دلچسپ بناتے ہیں اس میں بھرپور انداز سے
ملتے تھے۔ میرا خیال ہے اکرام باگ کی زیر نظر کتاب
قارئین کو ایک انوکھے تحیر کے جذبے سے سرفراز کرے گی
اور ایسے افسانوں پر جتنا نقادوں کو لکھنا چاہیے وہ نہیں لکھا
گیا تو اب کتاب ہاتھ پر ہوگی تو امید ہے اردو کی افسانوی
تنقید اکرام باگ کی قدرشناسی کی مخلصانہ کوشش کرے گی۔

اکتوبر ۲۰۱۳

ANDOKHTA

SHORT STORIES : IKRAM BAAG



AFLAAK PUBLICATIONS GULBARGA